پروفیسر کی غلطی

تاج کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور و کراچی

پروفیسر کی غلطی

اور

دوسرے ڈرامے

از

خلیل

ناشران

تاج کمپنی لمیٹڈ۔ قرآن منزل۔ ریلوے روڈ لاہور

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 019551
MAILSI

مندرجات

891.432
کتاب خانہ سردار جھنڈیر
میلسی (پاکستان)
نمبر شمار : ....
کتاب نمبر : ....
TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

پیش لفظ

اِن ڈراموں میں سے بعض کے پلاٹ اتارے گئے ہیں - اور یہ کوشش کی گئی ہے - کہ ہندوستانی فضا میں وہ کامیاب ثابت ہوں "پروفیسر کی غلطی" ایک طویل ڈرامہ ہے - جو رومان میں شائع ہوا اس وقت بعض کالجوں کی طرف سے یہ تحریک بھی ہوئی تھی - کہ اس ڈرامے کو کالج کی سٹیج پر کھیلا جائے - لیکن غالباً لاہور کی معاشرتی مجبوریاں آڑے آئیں - میں نے اِس میں مخلوط تعلیم کی ابتدائی مجبوریوں پر روشنی ڈالی ہے اور اس طریقِ تعلیم کو کہاں تک ہماری معاشرت قبول کر سکتی ہے - محاسن اور معائب دونو پیشِ نظر رکھے گئے ہیں اس لئے تعلیمی فضا خاص طور پر اس سے لطف اندوز ہو سکتی ہے -

"ایک عجیب پاگل" ایک ریڈیائی ڈرامہ ہے - جو مغرب کی فضا سے اُٹھایا گیا ہے - ندرتِ خیال کے باعث اُردو ڈراموں میں

یہ نئی چیز ثابت ہوگی۔

"شاعر کا آخری خط" محبّت کا ایک نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اِس میں ایک شاعر کا ذاتی احساس موجزن ہے۔

"مزدور کی ذہنیت" آج کل کے تصوّر سرمایہ داری پر ایک طنز ہے۔

"مرزا اور اس کے دوست" بات چیت کا ایک نرالا ڈھنگ ہے۔ شاید ڈراموں کی صف میں یہ ایک عجیب چیز ہوگی۔

"ایکٹرس" اور "ماتم" بھی انوکھے رنگ کے ڈرامے ہیں۔

اِن تمام ڈراموں میں سے ایکٹرس، ماتم، پروفیسر کی غلطی، مزدور کی ذہنیت اسٹیج کے لیے بہترین ڈرامے ثابت ہوسکتے ہیں۔ ماتم، پروفیسر کی غلطی، اور مزدور کی ذہنیت کو تو اوپن ایئر تھیئٹر پہ بھی آزمایا جاسکتا ہے

خلیل

پروفیسر کی غلطی

کردار:-

کشور ــــــــ ایک نوجوان طالب علم
راجکماری ــــــ کالج کی ایک طالبہ

پرکاش
اعجاز
مجید
رنبیر
کشن سین

} کشور کے دوست

پرنسپل
پروفیسر سکھ دیال
دو پروفیسر۔ نورا باورچی۔ چپڑاسی اور ہجوم:

پہلا منظر

(وقت چھ بجے شام)

(آل انڈیا نیشنل کالج کے ہوسٹل کا کچن۔ کچن میں کوئی خاص صفائی نظر نہیں آتی۔ البتہ دیگچیاں، چمچے۔ چینی کے برتن اور ایک شیشے کا جگ قرینے سے چنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نورا باورچی اپنے کام میں مصروف نظر آتا ہے۔ ساتھ ساتھ بھدی لے میں "دنیا میں غریبوں کو آرام نہیں ملتا" گا رہا ہے۔ اسی دھن میں ہے کہ ہنڈیا کے

جلنے کی بُو آتی ہے - وہ گھبرا کر ہنڈیا کی طرف دوڑتا ہے - اور اس بوکھلاہٹ میں چینی کی ایک پلیٹ گر کر ٹوٹ جاتی ہے - اس کی آواز دُور تک جاتی ہے - وہ اور بھی بدحواس ہو جاتا ہے ۔ شیشے کے "جگ" کو کلہاڑا سمجھ کر لکڑی پر مارتا ہے - وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتا ہے - پرکاش داخل ہوتا ہے)

پرکاش - کیا ہو رہا ہے ؟ یہ پلیٹ کیسے ٹوٹ گئی ؟

نورا - حضور ! اگر آپ دوسری پلیٹ کی قیمت مجھ سے :

لیں - تو میں ابھی آپ کو بتا دیتا ہوں ؛

پرکاش - جانور کہیں کا (شیشے کے ٹکڑوں کی طرف دیکھ کر)

ہائیں - جگ بھی ٹوٹ گیا ؛

نورا - حضور - یہ بھی ٹوٹ گیا ؛

پرکاش - کیسے ؟

نورا - حضور ! پانی کے بلبلے اور شیشے کے برتن کا کیا اعتبار -

پرکاش - اعتبار کا بچہ ! تم تو بالکل جانور ہو ؛

نورا - (اپنے بازوؤں اور کپڑوں کو دیکھ کر) حضور بالکل جانور

ہوں

پرکاش - (غصے سے) جانور کا بچہ -

نورا - حضور - میرا باپ تو اس کچن میں ملازم نہ تھا - وہ کیسے

جانور ہو گیا ؟

پرکاش - تم اس کا ثبوت موجود ہو -

(اعجاز ہنستا ہوا داخل ہوتا ہے - ٹوٹی ہوئی پلیٹ اور شیشے کے ٹکڑوں کو دیکھ کر قہقہہ لگاتا ہے)

پرکاش - یار تمہیں ہنسنے کے سوا اور کوئی کام نہیں اور یہاں یہ جانور صفایا کئے جاتا ہے - ہر روز ایک دو برتن توڑ دیتا ہے ؛

اعجاز - چھوڑو - کیوں غریب کے پیچھے پڑ گئے ہو - کل شام پروفیسر سکھدیال کے لیکچر میں تم کہیں نظر نہیں آئے -

پرکاش - ایک لیکچر ہو تو وہاں کوئی جائے بھی - آجکل تو لیکچر کرنا اور سننا فیشن میں داخل ہو گیا ہے اور تم جانتے ہی ہو - میں فیشن سے کس قدر دور بھاگتا ہوں -

اعجاز - لیکن یار - اُس نے تو بڑے مزے کی باتیں کہیں - کشور کے کمرے میں چنڈال چوکڑی بیٹھی ہے اور لیکچر پر خوب لے دے ہو رہی ہے - چلو گے نا ؟

(دوسرا منظر بدلنے کے لئے پردہ گرتا ہے - لیکن دو منٹ کے بعد پھر اُٹھتا ہے اور اس وقت ہمارے سامنے کشور کا کمرہ ہے - کمرے کے وسط میں ایک میز لگی ہوئی ہے جس پر ایک دو کتابیں بھی رکھی ہیں چند کرسیوں پر کشور کے دوست بیٹھے ہیں - کونے میں چارپائی بچھی

ہوئی ہے۔ کرسیاں کم ہونے کی وجہ سے وہاں دو آدمی بیٹھے ہیں۔ کشور ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا ہے۔ اس کے کمرے میں اقبال۔ ٹیگور۔ شیکسپیئر اور شون برن کی تصویریں لٹکی ہوئی ہیں۔ انگیٹھی پر چھوٹے فریموں کی دو تصویریں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک کونے میں اما کی اور دوسرے میں راجکماری کی۔ درمیان میں پھولدان رکھا ہے۔ جس کے پھول کملائے ہوئے ہیں۔ دوسرے کونے میں میز پر گراموفون رکھا ہے۔ پرکاش۔ اعجاز۔ مجید۔ رنبیر اور کنورسین وغیرہ سب وہاں موجود ہیں سب سوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ کشور ان میں سے زیادہ خوبصورت ہے اور چہرے سے ذہانت ٹپکتی ہے۔

اعجاز کے ہاتھ میں کالج کا میگزین ہے)

اعجاز۔ کشور! تمہاری یہ نظم کچھ ننگی سی ہے۔

کشور۔ کچھ نہیں۔ بلکہ بالکل۔

کنورسین۔ یاد ہے کل پروفیسر دیال نے بھی تم پر چوٹ کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ آجکل کے نوجوانوں کو شاعر بننے کا بہت خبط ہو گیا ہے اور عریانی کو ہی بہترین آرٹ تصور کرتے ہیں۔

کشور۔ پروفیسر دیال کی تو مجھے کچھ پروا نہیں۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ آپ جیسے نوجوان بھی ان سیدھی سادی باتوں

کو نہیں سمجھ سکتے۔

زبیر۔ ہم کیا کریں۔ کل کا لیکچر تو تم سن ہی بیٹھے ہو اب ہمارے کانوں میں اس قسم کی واہیات باتیں ڈال دی جائیں۔ تو ہم سے کیا توقع کر سکتے ہو!

کشور۔ دراصل یہ ہماری معاشرت کی خامیاں ہیں۔ وہ لوگ نہیں جانتے کہ جو مسائل ایک نوجوان کے لئے کس رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں۔

زبیر۔ لیکن انہوں نے ہمیں سمجھا ہی کیا ہے۔ مندر کے لنگوٹ بند پجاری؟ یا ہمالیہ کے کسی سنسان اور غیر آباد گوشے میں رہنے والے سادھو؟ کیا وہ خدا کے خلاف جنگ کرنا چاہتے ہیں یہ فطرت کا تقاضا ہے۔ میں تو جانتا ہوں کہ ہم ہوٹلوں اور ریسٹورنٹوں میں بے دھڑک جایا کریں۔ اور وہاں لڑکیوں سے مکس اپ ہوا کریں۔

مجید۔ زبیر! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔

زبیر۔ دیکھو مجید تمہیں کبھی لڑکیوں کے کالج میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ بیچاری ایک نوجوان کی سوسائٹی کے لئے تڑپ رہی ہوتی ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ اگر میں ان کے کالج میں بوٹ پالش کرنے کے لئے بھی رکھ لیا جاؤں تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی سنور گئی۔

کشور - ہش! یہ بہت گزرا ہوا خیال ہے - میں تو یہ جانتا ہوں کہ کالج کے نوجوانوں کو Morals اور خودداری کے جذبے کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے - لیکن Morals وہ نہیں ہونا چاہیئے جو بوڑھے ہمارے لئے تجویز کرتے ہیں - بلکہ ہمارے جذبات ہماری دنیا اور ہمارے ذہنی ماحول کے مطابق ہوں -

رنبیر - کشور! آخر یہ کیا ہو رہا ہے - ہم جوان، ہماری دُنیا ئیں جوان، ہماری اُمنگیں جوان اور اس پہ اتنی قید، تم نہیں جانتے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے کہنے کو تو کہہ دیا کہ یہاں پر —— مخلوط —— ہے لیکن اس کا فائدہ - ایک دفعہ کلاس میں میری نگاہ ایک لڑکی پہ جا پڑی کہ پروفیسر کے نزدیک ہی بیٹھی تھی نا، اور سامنے، اور محض اتفاقاً — تو جناب پروفیسر صاحب نے میری طرف اس بندر کی طرح دیکھا - جس کے ہاتھ سے چنے چھین لئے گئے ہوں - اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور مجھے جھلّا کر کہنے لگے " رنبیر. اپنے سبق کی طرف دھیان دو " اس کا مطلب یہ تھا کہ اس لڑکی کی طرف مت دیکھو - لڑکیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ بنچ مقرر کر دیئے گئے ہیں - پروفیسر انہیں اپنے پہلو میں —

مطلب ہے کہ بالکل نزدیک بٹھاتا ہے - ہماری کلاس میں

کتنے سٹوڈنٹس ہیں ؟

اعجاز - ایک سو پانچ -

زبیر - کیا اِن میں سے ایک بھی اس قابل نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے - کشور! اِسی کو - اخلاق - کا معیار کہتے ہو یہ معلوم ہے کہ تمہیں بدمعاش اور لفنگا سمجھ کر لڑکیوں کو تمہارے ساتھ بیٹھنے نہیں دیا جاتا - آزادی سے ملنے جلنے سے باز رکھا جاتا ہے - آخر یہ کیوں ؟

کشور - یہ سب ——— مخلوط تعلیم ——— کی خامیاں ہیں ، ہماری سوسائٹی ابھی تک اس امر کی اجازت نہیں دیتی - کہ ہم لڑکیوں سے بغیر جھجک کے مِلا جلا کریں -

زبیر - اب آئے تم سیدھے راستے پر - ارے بھلے مانس! میں تو یہی کہہ رہا ہوں - کہ ایسی سوسائٹی اور دقیانوسی روایات کو توڑنا ہم تم نوجوانوں کا پہلا فرض ہے - میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر اِس قسم کی پابندیاں ہم پر جاری رہیں تو ہمارا اخلاق کبھی درست نہیں ہو سکتا ۔

کنور سین - اور اگر ملنے جلنے سے خرابیاں پیدا ہو گئیں تو ۔۔۔ ؟

زبیر - ڈاکٹر جب کسی بیماری کا علاج کرتا ہے تو وہ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ دوا دینے کے بعد بیماری کی شدت ہو جائے گی - وہ خوب جانتا ہے کہ اِس شدت کے بعد آہستہ

آہستہ مریض شفایاب ہو جائے گا۔

پرکاش۔ یہ ہومیو پیتھک علاج ہے اور ہومیو پیتھک میں آجکل بہت کم لوگوں کا اعتقاد ہے۔

رنبیر۔ وہ لوگ جو بیماری کو جڑ سے گنوا دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس میں اعتقاد رکھتے ہیں۔

کشور۔ رنبیر۔ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئیے۔ کہ ہر ایک نوجوان کے سینے میں دِل ہوتا ہے اور دل میں جذبات کا بے کنار سمندر موجزن ہوتا ہے اور ——

رنبیر۔ (بات کاٹ کر) اِسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ عورت اور مرد اکٹھے رہ کر الگ نہیں رہ سکتے اور اگر انہیں الگ کرنے کی کوشش کی گئی تو ہزار ہا خرابیوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ارے بھائی! یہ تو فطرت کا تقاضا ہے (جلدی اپنی جیب سے مقناطیس اور لوہا کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نکالتا ہے) یہ فطرت کا تقاضا ہے۔ دیکھو (لوہے کو مقناطیس کے نزدیک کرتا ہے جو لپک کر چمٹ جاتا ہے) عورت اور مرد غیر جنس ہونے کے باوجود آپس میں اس طرح مِلتے ہیں اور اگر تم اب بھی اس سے انکار کرو تو تم ایسے شخص کی طرح ہو جو کہے کہ محبت "ن" کے حرف سے شروع ہوتی ہے۔ سمجھے؟

کشور۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ دُنیا، انسان، کائنات بلکہ

خدا بھی کنونیشن کے ساتھ قائم ہے۔ زندگی سے منہ موڑا جا سکتا ہے۔ لیکن کنونیشن کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ البتہ آہستہ آہستہ جب کئی نسلیں تباہ و برباد ہو جائیں گی تو ممکن ہے کوئی نسل اس میں کامیاب ہو جائے۔ آج ہم اپنے آپ کو معاشرت کے باغی نہیں بنا سکتے۔

رنبیر۔ باغی؟ کشور! یہ جنگ ایک مقدس فرض ہے۔ جتنی جلدی لڑی جائے گی۔ اتنی ہی انسانیت کے لئے بہتر ہوگی۔

کشور۔ لیکن ہمارے بڑوں کے بنائے ہوئے اصولوں کو پاک نگاہ سے دیکھنا ہمارا فرض ہے۔

رنبیر۔ اُن کو نذرِ آتش کر دو۔

کشور۔ اس جد و جہد میں ہمیں دنیا سے لڑنا ہوگا۔

رنبیر۔ دنیا سے لڑنا گناہ نہیں۔ فرد سے لڑنا گناہ ہے۔ اگر گناہ ہو بھی تو میں سمجھتا ہوں کہ جس گناہ سے ایک بھاری ثواب حاصل ہو وہ گناہ نہیں۔

کشور۔ (وقفہ) سوال تو یہ تھا۔ کہ اخلاق کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے؟

رنبیر۔ اس طرح کہ ہم سے یہ نہ کہا جائے کہ اپنا اخلاق قائم رکھو۔

کشور۔ جب تک نوجوانوں کو بُرائی سے آگاہ نہ کیا جائے۔ وہ بُرائی کو بُرائی نہیں سمجھتے۔

رنبیر - اور اگر تمہارا اگلا دبوچ کر تم سے یہ کہا جائے کہ تم راجکماری سے ملتے ہو - یہ بُرائی ہے اور تمہیں اس کو چھوڑنا ہوگا پھر؟

کشور - لیکن میں کوئی بُرا کام نہیں کر رہا -

رنبیر - دنیا، کالج کے لڑکے اور پروفیسر اسے بُرائی سمجھتے ہیں

کشور - میں اس سے محبّت کرتا ہوں -

رنبیر - پروفیسر دیال کے نزدیک محبّت سب سے بڑی بُرائی ہے -

کشور - میری محبت پاکیزہ ہے -

رنبیر - ہماری معاشرت کے نزدیک پاکیزہ کا لفظ ایک ڈھکوسلہ ہے -

کشور - لیکن ہماری معاشرت . . . .

رنبیر - (فقرہ مکمل کرتا ہے) یہ بھی ایک ڈھکوسلہ ہے - یہی کہنے لگے تھے نا؟ اور میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ اس ڈھکوسلے کو بے نقاب کرنا میرا تمہارا اور سب نوجوانوں کا فرض ہے اگر آج تمہیں محض اس وجہ سے کالج سے نکال دیا جائے کہ تم راجکماری سے محبّت کرتے ہو تو کیا تمہارے سینے میں تمہارا دل بغاوت نہیں کریگا؟ کالج کی تاریخ میں تم ایسا آج تک کوئی شاعر پیدا نہیں ہو سکا - تمہاری ذہانت اور قابلیت پر کالج جتنا بھی فخر کرے کم ہے - تم اس قابل ہو - کہ

تمہارے چلے جانے کے بعد کالج کے ہال میں تمہاری قد آدم تصویر آویزاں کی جائے۔ لیکن اگر محض راجکماری کی وجہ سے تمہیں ذلیل کر کے کالج کی دیواروں سے باہر پھینکدیا جائے تو تم اسے کیا کہو گے؟ معاشرت؟ سوسائٹی؟ بڑوں کے بنائے ہوئے اصول؟ اور ہمارے پروفیسروں کی دانشمندی؟

اعجاز۔ چھوڑو یار! یہ بحث لمبی ہو رہی ہے؟ کشور: میں شاعری پر ایمان تو نہیں رکھتا۔ میں نثر نگار ہوں لیکن کوئی چیز سناؤ۔

کشور۔ (ایک لمبی سانس لے کر گاتا ہے۔

دل و دماغ کو رو لوں گا۔ آہ کر لوں گا
تمہارے عشق میں سب کچھ تباہ کر لونگا
اگر مجھے نہ ملیں تم۔ تمہارے سر کی قسم
میں اپنی ساری جوانی تباہ کر لوں گا
جو تم سے کر دیا محروم آسماں نے مجھے
میں اپنی زندگی صرف گناہ کر لوں گا
تمہاری یاد میں میں کاٹ دونگا حشر کے دن
تمہارے ہجر میں راتیں سیاہ کر لوں گا
ثواب کیلئے ہو جو گناہ وہ عین ثواب خدا کے نام پہ بھی اک گناہ کر دونگا

(جب کشور آخری شعر پہ پہنچتا ہے تو پروفیسر دیال داخل ہوتا ہے۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا ہے سب لڑکے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر کمرے کا جائزہ لیتا ہے اور انگیٹھی پر راجکماری کی تصویر دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے)

پروفیسر۔ (کشور سے مخاطب ہو کر) کیوں جی شاعر صاحب! یہ کالج کا ہوسٹل ہے یا کسی فلم کمپنی کا سٹوڈیو؟

کشور۔ یہ آپ کے کالج کا ہوسٹل ہے

پروفیسر۔ لیکن آپ شاعر تو ہیں۔ گویئے کب سے ہو گئے؟

کشور۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا۔

پروفیسر۔ تم میرے کسی سوال کا جواب دے ہی نہیں سکتے۔ تم اپنی زندگی تباہ کر رہے ہو (آگ بگولہ ہو کر) اور یہ راجکماری کی تصویر یہاں کیوں پڑی ہے؟

(کشور خاموش ہے)

پروفیسر۔ اس سوال کا جواب بھی تمہارے پاس نہیں ہو گا؟

کشور۔ ہے تو سہی مگر ابھی نہیں دے سکتا۔

پروفیسر۔ کیا ہے؟ یہی کہ تم راجکماری سے محبت کرتے ہو؟ کیا تم یہ بات نہیں جانتے کہ میں راجکماری کا گارڈین ہوں؟ کیا اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ تم کالج کے طالبعلم

پر کلنک کا ٹیکہ لگا رہے ہو؟ مجھے بدنام کر رہے ہو۔
تم تو برباد ہو چکے ہو اور مجھے تمہاری بربادی کا افسوس
بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن دوسروں کو کیوں بدنام کر رہے
ہو؟ اپنا یہ رومان فوراً بند کر دو۔ میں پہلا اور
آخری آدمی ہوں جو ہر قدم پر مخالفت کروں گا اور جانتے
ہو میری مخالفت کا نتیجہ؟

کشور۔ وہ تو میں جانتا ہوں۔ لیکن آپ کو میری پرسنل باتوں میں
دخل نہ دینا چاہیئے۔

پروفیسر۔ تمہاری پرسنل باتیں، وہ باتیں جن سے کالج کے وقار
میں فرق آ رہا ہے اور پانچ سو لڑکوں پر زہریلا اثر پڑ رہا ہے
تمہاری پرسنل ہو گئیں۔
(غضبناک ہو کر انگیٹھی کی طرف بڑھتا ہے اور راجکماری
کی تصویر اٹھا کر فرش پر زور سے مارتا ہے۔ تصویر
ٹوٹ جاتی ہے)

کشور۔ (چہرہ غم سے نڈھال ہو گیا) آہ پروفیسر صاحب آپ
نے یہ کیا کیا؟

پروفیسر۔ وہی جو تم دیکھ رہے ہو اگر تم نے راجکماری کا خیال نہ چھوڑا
تو آج سے مجھے اپنا دشمن سمجھو۔

کشور۔ اس کا خیال اب انتہائی کوشش سے بھی میرے دل سے

نہ نکل سکے گا۔

رنبیر۔ پروفیسر صاحب (جلدی اپنی جیب سے مقناطیس اور لوہے کا ٹکڑا نکالتا ہے) آپ اس لوہے کو باز رکھ سکتے ہیں؟

پروفیسر۔ بکو مت۔ کشور! میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔

(پروفیسر باہر نکل جاتا ہے۔ کشور غمناک ہو کر تصویر کے ٹکڑے جمع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اعجاز لپک کر گراموفون کا ریکارڈ "اب کیوں روتا ہے پگلے" لگا دیتا ہے۔ اس ریکارڈ نے سب کو رنجیدہ کر دیا۔ آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے)

دوسرا ایکٹ

(پروفیسر سکھدیال کا کمرہ جدید طریقے پر آراستہ کیا ہوا ہے۔ اس کے دروازے ہیں جو آمنے سامنے کھلتے ہیں۔ ایک بڑی کھڑکی بھی ہے۔ جس پر ایک ریشمی پردہ لٹک رہا ہے۔ بیچ میں تین تپائیاں بھی رکھی ہیں ایک پر کچھ کتابیں ہیں دوسری پر ایک پیتل کا گملا اور تیسری خالی ہے۔ ایک صوفے پر راجکماری بیٹھی اُون سے کچھ بُن رہی ہے اور اس کے سامنے پروفیسر لکھنے والی میز پر بیٹھا ہوا امتحان کے پرچے دیکھ رہا ہے۔ راجکماری

ایک نفیس ساڑھی پہنے ہوتے ہے اور پروفیسر نے سوٹ پہن رکھا ہے)

پروفیسر۔ (اپنے آپ سے) کم بخت سوال کچھ ہوتا ہے اور جواب کچھ دیتے ہیں۔ امتحان کو امتحان سمجھتے ہی نہیں۔ اُن کا خیال تو اُس وقت سینما گھروں میں چکر کاٹ رہا ہوتا ہے یا کسی ریسٹورنٹ کی دیواروں میں جذب ہو رہا ہوتا ہے۔ کتابیں تو اُن کے خواب میں بھی نہیں آسکتیں۔

راجکماری۔ (بننے میں مصروف ہے۔ اچانک بے خیالی میں کہہ جاتی ہے) سارا دن تو کتابوں میں بیت جاتا ہے اگر بیچارے Variety کو مدِنظر نہ رکھیں، تو ان کی زندگی اجیرن ہو جائے۔

پروفیسر۔ کیا کہا Variety؟ طالب علم کو Variety کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ کتابیں اس کے لئے کافی نہیں؟

راجکماری۔ میرے خیال میں صرف کتابیں کافی نہیں۔ زندگی کا مقصد صرف کتاب سے پورا نہیں ہو جاتا۔ وہ نوجوان جو۔۔۔

پروفیسر۔ (بات کاٹ کر) دیکھو راجکماری! تمہاری زبان پر اس قسم کے الفاظ نہیں آنے چاہئیں۔ میں ان باتوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

راجکماری (مسکرا کر) آپ تو بہت جلد ناراض ہو جاتے ہیں دیکھئے نا۔ آخر میں بھی اس وقت جوان ہوں اور مجھے ہر بات پر سوچ بچار

کرنے کا حق ہے۔ صرف جوان دل ہی جوان دل کو پہچان سکتا ہے آپ ناراض نہ ہو جئے گا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ نوجوان جو اپنے گھر کی فضا سے دُور تعلیم پا رہا ہے اُسے عورت سے دلچسپی نہ ہونے دینا کس قدر پاپ ہے۔

پروفیسر۔ مجھے یہ آزاد خیالی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ عورت اور مرد کو اپنی اپنی حد پر رہنا چاہیئے۔ راجکماری! اِن کالج کے لڑکوں کو تم نہیں پہچانتیں۔ بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔ اُف! توبہ شیطان بھی اِن سے بھاگے۔ کہ خدا کی پناہ لیتا ہے۔ لڑکیوں کو اُلّو بنانے میں یہ انتہائی فخر محسوس کرتے ہیں۔ دس دن ایک لڑکی سے محبت کی۔ اس کے بعد اس کو چھوڑ دیا اور جب کر رہے ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجنوں دوبارہ پیدا ہو گیا ہے۔ کس مزے سے کہتے ہیں۔ پیاری اگر کہو تو تارے بھی آسمان سے کھینچ کر تمہارے پاؤں میں ڈال دوں۔ لیکن حقیقت میں وہ اس معصوم لڑکی کے راستے میں پتھر پھینک رہے ہوتے ہیں۔

راجکماری۔ یہ تو آپ درست کہہ رہے ہیں۔ لیکن اسکا یہ مطلب تو نہیں کہ نوجوان عورت اور مرد کا آپس میں ملنا بالکل ناجائز ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بہتے ہوئے تیز دھارے کو روکنا بہت مشکل ہے۔ اور میں تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ

ہمارے بزرگ جس قدر روک تھام کئے جائیں گے۔ اسی قدر ہمارے نوجوانوں کے اخلاق پست ہوتے جائیں گے اور سختی تو کبھی حالت میں جائز نہیں ؛

پروفیسر۔ تم نہیں سمجھتیں راجکماری! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے میں بھی جوان تھا۔ میں نے دُنیا کی اونچ نیچ دیکھی ہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ ایک جوان عورت ایک جوان مرد کی سوسائٹی میں کس قدر کمزور ہو جاتی ہے۔ اگر تم یہ چاہتی ہو۔ کہ یہ خرابیاں پیدا ہی نہ ہوں تو اس کی صرف ایک صورت ہے کہ ان خرابیوں کی ہر ممکن طریقے سے روک تھام کی جائے۔ جب کلی پھول بن کر کھِل جائے تو اس وقت خوشبو کو تھامنا غیر ممکن ہو جاتا ہے ؛

راجکماری۔ پچھلے برس کا کیس تو آپ کو یاد ہی ہوگا ؟

پروفیسر۔ کون سا ؟ منموہن کا ؟

راجکماری۔ ہاں۔

پروفیسر۔ تو کیا تم سمجھتی ہو کہ اس کا کالج سے نکالا جانا ناجائز تھا۔

راجکماری۔ قانونی حیثیت سے تو جائز تھا۔ لیکن اخلاقی حیثیت سے بالکل نامناسب۔

پروفیسر۔ بالکل نامناسب۔ تم سمجھتی ہو کہ اس نے جو فعل کیا تھا وہ سزا کا مستحق نہ تھا ؟

راجکماری۔ سزا دینے کا بھی کوئی طور ہونا چاہیئے۔ آپ لوگ کالجوں میں کیا کر رہے ہیں؟ نوجوان کو ماں باپ کی غیر حاضری میں اگر آپ اپنے بیٹے تصوّر نہ کریں گے تو تعلیم کا اصل مقصد پورا نہ ہو سکے گا۔ میں گستاخی کی معافی چاہتی ہوں۔ لیکن کبھی آپ کے دل میں یہ احساس بھی پیدا ہوا؟ آپ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ لیکچر دینا۔ شیکسپیئر کے چند اُلٹے سیدھے نوٹ لکھا دینا بلیک بورڈ پر کچھ لکیریں کھینچ دینا۔ جو شخص حاضری کے وقت حاضر نہ ہو۔ اس کو بڑی احتیاط سے غیر حاضر شمار کرنا۔ جو لڑکا اپنی تنگ دستی کے باعث دو مہینے تک فیس نہ ادا کر سکے اس کو کالج سے خارج کر دینا۔ کوئی نوجوان اگر کسی لڑکی سے اتفاقاً چھیڑ خانی کر بیٹھے۔ اس کی زندگی وبال جان بنا دینا۔ کرکٹ ٹیم کو امتحان سے مستثنےٰ کر دینا۔ کیونکہ وہ کالج کے ناموس کی حفاظت کر رہی ہے۔ جس بُرائی سے کالج کا وقار قائم رہے اس کی اجازت دے دینا۔ یہی ہے نا آپ کا ڈسپلن اور آپ لوگوں کا گھڑا ہوا اخلاق؟

(راجکماری کا رنگ غصّے سے سُرخ ہو جاتا ہے۔ اور سانس پھُول جاتی ہے)

پروفیسر۔ راجکماری! تم غلطی پر ہو۔ لیکن خیر تم بہت جلد سمجھ جاؤ گی۔ مجھے یونیورسٹی گراؤنڈ میں جانا ہے۔ آج کالج کا کرکٹ میچ

ہو رہا ہے ۔

(پروفیسر عقبی دروازہ سے باہر نکل جاتا ہے راجکماری سلائیاں اور بنیان میز پر رکھ دیتی ہے اور کسی گہری سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ اتنے میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے)

راجکماری ۔ تشریف لائیے (کشور اندر آتا ہے) آپ ہیں!

کشور ۔ کیا بات ہے آپ کچھ خفا بیٹھی ہیں ؟

راجکماری ۔ معلوم نہیں ۔ کیا وجہ ہے کہ ہمیشہ آپ کے آنے سے چند لمحہ پیشتر پروفیسر صاحب غیر خوشگوار اور افسوسناک گفتگو میں مصروف ہوتے ہیں ۔ اُن کی باتوں سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے ۔

کشور ۔ پروفیسر کی ہستی واقعی قابلِ قدر ہے اور میں تو اتنا چاہتا ہوں کہ اِن ذات شریف کی کسی بات سے تمہیں صدمہ نہیں ہونا چاہیئے ۔

راجکماری ۔ کشور! میں یہ نہیں چاہتی کہ تم پروفیسر صاحب کی توہین کرو ۔

کشور ۔ میں بھی یہ نہیں چاہتا لیکن کیا کیا جائے ۔ وہ خود چاہتے ہیں ۔

راجکماری ۔ کس طرح ؟

کشور ۔ ایک لمبا افسانہ ہے ۔ مختصر اتنا کہے دیتا ہوں کہ آپ

نے کل سارا دن اِسی بحث میں پرنسپل سے گذار دیا کہ وُہ
مجھے کالج سے نکال دیں ٭

راجکماری - کالج سے نکال دیں -

کشور - جی ہاں - اور دو گناہوں کی بنا پر - پہلا یہ کہ میں شاعر
ہوں - دوسرا یہ کہ میں تم سے مِلتا ہوں -

راجکماری - کیا یہ دونوں گناہ ہیں ؟

کشور - بہت بھاری - سنتا ہوں کہ شیکسپیئر نے کالج میں تعلیم
نہیں پائی تھی - ورنہ اس پاجی کو بھی شعر کہنے کے باعث کان سے
پکڑ کر کالج سے باہر نکال دیا جاتا - لیکن میں تو حیران ہوں کہ
ہمارے " بزرگانِ کالج " شاعروں سے کیوں نفرت کرتے
ہیں - حالانکہ ہماری تعلیم میں شاعروں کے دیوانوں کے سوا
اور کچھ بھی نہیں - شاید وہ انگریزی شاعر ہیں اس لئے انہیں
ہمارے دماغوں میں ٹھونسا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے دیکھو !
یہ تھے انسان - اِن کی زندگی کو اپنے ذہن میں نقش کر لو -
اور تم نے جو اپنی زبان میں شعر کہا تو تم جیسا بدمعاش کوئی نہ
ہوگا - اب اِن لفنگوں کو کوئی کیا کہے !

راجکماری - میں نہیں سمجھتی - ہمیں یہ تعلیم کِس منزل کی طرف
لے جا رہی ہے ؟ اور . . . اور مجھ سے ملنا !

کشور - یہ تو اتنا بھاری گناہ ہے کہ جِس کا کفارہ ادا ہی نہیں

ہو سکتا۔ اگر میرا اختیار رہتا تو ان تمام "بزرگوں" کو عجائب گھر والی توپ کے سامنے رکھ کر ایک دم اُڑا دیتا

راجکماری۔ (مسکرا کر) لیکن وہ توپ چلے اُگی بھی نہیں۔

کشور۔ (ہنستے ہوئے) تو میں کون سا اُڑانے لگا تھا (دونو قہقہہ لگاتے ہیں) راجکماری! مصیبت تو یہ ہے کہ وہ ہم نوجوان کی صحیح رُوح کو نہیں سمجھ سکتے۔

راجکماری۔ اِس بات کی شکایت فضول ہے۔

کشور۔ مجھے تو شکایت کسی بات کی نہیں۔ البتہ رہ رہ کر ان لوگوں پر افسوس ضرور آتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں۔ لیکن اتنا سمجھتا ہوں کہ کالج کی زندگی میں میں نے دنیا کی بہترین چیز کو پا لیا ہے۔ ایک ایسا پھول جس نے میری ساری کائنات کو معطّر کر دیا — ایک ایسی شمع جس نے میری زندگی کے سارے راستوں کو اجاگر کر دیا!

راجکماری۔ (مُسکراتے ہوئے) کیا میں اس چیز کا نام پوچھ سکتی ہوں؟

کشور۔ شہزادیوں کا نام ان کے سامنے نہیں لیا جاتا۔

(دونو کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں)

راجکماری۔ کشور! اگر پروفیسر صاحب ہم دونوں کو یہاں اکھٹے دیکھ لیں تو کیا ہو؟

کشور۔ بلبل کو پھول کے ساتھ۔ چکور کو چاند کے ساتھ اور پروانے
کو شمع کے ساتھ دیکھ کر جب دُنیا اعتراض نہیں کرتی۔ تو
میرا تمہارے ساتھ بیٹھنا قابل سزا نہیں ہو سکتا۔
راجکماری۔ اگر پروفیسر صاحب یہاں آ جائیں تو تمہاری ساری
شاعری دھری رہ جائے۔
کشور۔ اپنی شاعری تو پہلے ہی کسی کے چرنوں پہ نچھاور کر چکا ہوں۔
راجکماری۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ میں دیوی ہوں اور ــــ
کشور۔ میں پجاری۔
راجکماری۔ پجاری صاحب! آپ ہمیشہ چھپ چھپ کر میری پوجا
کرتے ہیں۔ پجاری تو دنیا سے نہیں ڈرا کرتے۔
کشور۔ ڈرنے والا تو میں بھی نہیں۔
راجکماری۔ لیکن ڈرتا ہوں خیر چھوڑو اس قصے کو۔ اگر میں آپ
سے رسمی طور پر کہوں "جناب! اپنا تازہ کلام تو سنایئے"۔ تو
آپ کیا کہیں گے۔
کشور۔ میں فوراً سنانا شروع کر دونگا۔
راجکماری۔ بڑے ڈھیٹ ہو۔ کشور! دُنیا ابھی تک رسمی باتوں
میں جکڑی ہوئی ہے۔ ہم بڑے بوڑھوں کو بُرا تو کہتے ہیں
لیکن ہم وہی ہیں جو ہم نہیں ہیں۔
کشور۔ یا ہم وہ نہیں جو ہیں۔

راجکماری ! — اچھا، اب رسمی باتیں برطرف۔ سُنائیے! اِن دِنوں کیا لکھا ہے۔

کشور۔ اچھا! (گاتا ہے)

راجکماری۔ گانا تو یوں شروع کر دیا۔ گویا تان سین کی رُوح آپ ہی میں داخل ہو گئی ہے۔

کشور۔ آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔ سُنیئے (گاتا ہے)

تم کیا ہر ایک مجھ سے بیزار ہے جہاں میں
عنوان بے کسی ہوں دُنیا کی داستاں میں

روشن ہے تیرے جلووں سے عالم تصوّر
چھٹکے ہوئے ہیں تارے خاموش آسماں میں

مجھ کو بدل دے یا رب یا دل بدل دے اس کا
یا یہ بتا دے کیونکر زندہ رہوں جہاں میں

(جب وہ آخری شعر پر پہنچتا ہے تو پروفیسر اندر داخل ہوتا ہے۔ کشور گانا بند کر دیتا ہے پروفیسر کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے اور کشور کا رنگ زرد ہو گیا ہے پروفیسر دروازے میں ہی کھڑے ہو کر تحکمانہ انداز میں کہتا ہے)

پروفیسر۔ کشور! (کشور کھڑا ہو جاتا ہے) نکل جاؤ یہاں سے۔ میں سمجھتا تھا کہ تم کسی شریف آدمی کے بیٹے ہو۔ لیکن

راجکماری۔ پروفیسر صاحب!

کشور۔ میں اس وقت آپ کے مکان میں ہوں۔ اس لئے آپ کو مجھے گالی نہ دینی چاہیئے تھی۔

پروفیسر۔ خاموش رہو۔ کمینے!!

کشور۔ میں کمینہ؟ (غصے سے لرز رہا ہے) آخر میرے باپ نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ آپ کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ میں ایک شریف آدمی کا بیٹا ہوں۔ اور خود بھی شریف النفس ہوں۔ میں نے یہ الفاظ آج تک کسی سے نہ سنے تھے۔ آپ نے مجھے گالی دے کر میرے دل کی گہرائیوں میں بغاوت کے فتنے کو بیدار کر دیا ہے۔

پروفیسر۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تم کمینے ہو۔

کشور۔ یہ دنیا جانتی ہے کہ کون کمینہ ہے۔ پروفیسر صاحب! آپ کی زبان سے یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ مجھے اس ساری دنیا میں آپ سے بڑھ کر کوئی کمینہ نظر نہیں آتا۔ سنتے ہیں آپ؟

راجکماری۔ (غضبناک ہو کر) کشور!!

پروفیسر۔ کیا بک رہے ہو؟ میں — کمینہ — اُف!

کشور۔ ہاں! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ سنئے پروفیسر صاحب! آپ نے مجھے بُرا کہہ کر میرے خاموش تاروں کو چھیڑ دیا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ وہ لڑکی جو آپ کے سامنے کھڑی ہے۔ کون ہے۔ (راجکماری آنکھیں نیچی کر لیتی ہے) آہ! آپ اِسے نہیں پہچان سکتے۔ آپ کے پاس وہ آنکھیں ہی نہیں۔ جس سے آپ پہچان سکیں۔ آپ صِرف اِتنا جانتے ہیں کہ اس کا نام راجکماری ہے اور بس! آپ یہ تو جانتے ہی نہیں کہ کشور اس سے محبت کرتا ہے۔

پروفیسر۔ (جھلّا کر) میں نہیں سن سکتا۔

کشور۔ آپ کو سننا ہی ہوگا۔ جب تک آپ وہ باتیں نہ سُنیں گے جن کو آپ سُننا نہیں چاہتے تو دنیا کی آپ کوئی بات بھی نہ سُن سکیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ تمام عمر بہرے ہی رہیں ۔۔۔ کشور اس سے محبت کرتا ہے اور عمر بھر محبّت کرتا رہیگا کشور کی دنیا صرف اِسی پریم کی مورت پر قائم ہے۔ میرے لئے دنیا میں اور کچھ بھی نہیں۔ آپ میری باتیں غور سے سُنیں گے اور راجکماری کی صحیح قیمت معلوم کر لیں گے تو آپ پر یہ راز کھل جائیگا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ درست ہے۔

پروفیسر۔ راجکماری! یہ کیا ہو رہا ہے؟ (راجکماری سر جھکائے خاموش رہتی ہے)

کشور۔ جو کچھ ہونا تھا۔ وہ مدّت سے ہو چکا۔ اب میں آپکو اجازت دیتا ہوں کہ آپ کی طبیعت میں جو آئے بڑے شوق سے کیجئے میں

آپ کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔ البتہ اتنا یاد رہے کہ آپ مجھے دُکھ پہنچا کر ایک معصوم اور بے لوث روح کو بھی آزار پہنچا رہے ہیں۔

(اتنا کہہ کر کشور باہر نکل جاتا ہے۔ پروفیسر کچھ غصے سے اور کچھ حیرت سے اس کے پیچھے دیکھتا ہے۔ راج کماری بھی معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہے اور آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے)

دُوسرا منظر

(پرنسپل کے کمرے کا اندرونی منظر۔ تین پروفیسر جن میں پروفیسر سکھ دیال بھی شامل ہے بیٹھے ہیں۔ پرنسپل اُونچی میز کے سامنے بیٹھا ہے اور تینوں پروفیسر کرسیوں پر (ذرا فاصلے پر) بیٹھے ہیں۔ جب پردہ اُٹھتا ہے تو پروفیسر سکھ دیال پرنسپل سے باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے)

پروفیسر۔ جناب میں نہیں سمجھتا کہ اس دَور کے نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ زندگی کی اہمیت کو مطلق نہیں سمجھ سکتے۔ کشور کا قصہ تو میں آپ کو سُنا ہی چکا ہوں۔ اُف۔ آج کا نوجوان کل سے بے نیاز ہو کر پست ترین گڑھے میں گرتا چلا جا رہا ہے ؞

پرنسپل۔ آخر انہیں سنبھالنا بھی تو ہمارا ہی فرض ہے ؞

پروفیسر۔ سنبھالنا؟ یہ لونڈے تو ہم بوڑھوں کو سنبھالنے کی فکر میں ہیں اور میں کہتا ہوں کہ اُن کا بس چلے تو ہمیں ایسی جگہ ماریں جہاں سے پانی میسّر نہ آئے۔

دوسرا پروفیسر۔ آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔

پرنسپل۔ آپ کی رائے میں کیا کرنا چاہیئے؟

پروفیسر سکھدیال۔ میں نے آپ کو سارا قصّہ بتا دیا ہے اس کے بعد غالباً کسی اور رائے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں!

پرنسپل۔ یہ کہ کشور کو کالج سے نکال دیا جائے۔

پروفیسر۔ بالکل۔

پرنسپل۔ لیکن آپ اتنا غور کیجئے کہ دنیا میں کس قدر بدنامی ہوگی کہ ایک لڑکی کے لئے ایک ہونہار طالب علم کو کالج سے نکال دیا گیا۔

پروفیسر۔ تو آپ کے خیال میں بُرائی کو جڑ سے اکھیڑ دینے کی بجائے بُرائی کی پرورش کرنا زیادہ ٹھیک ہے؟

پرنسپل۔ اگر وہی بُرائی نیکی میں تبدیل ہو سکتی ہو تو کیا ہرج ہے۔

پروفیسر۔ دنیا میں آج تک ایسا نہیں ہوا۔ بُرائی کو نیکی میں تبدیل کرنے کی کوشش ہمیشہ بُرائی کو طاقت پہنچاتی ہے اور ہمارے کالجوں میں تو یہ عدم تشدد کبھی نہ ہو سکیگا۔

دوسرا پروفیسر۔ اِس مخلوط تعلیم نے تو ہماری سوسائٹی کا ستیاناس

کر دیا ہے - میں تو ہمیشہ اس کے خلاف ہوں -

پرنسپل - آپ نے تعلیم کو صحیح معنوں میں نہیں سمجھا - لڑکے اور لڑکیوں کا اکٹھے مل بیٹھنا کسی صورت میں انکو بُرائی کی طرف مائل نہیں کرتا خرابی تو اس صورت میں پیدا ہوتی ہے کہ جب ہم نوجوانوں کے ذہن میں یہ بات ڈال دیں کہ لڑکیوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی اُن کے اخلاق کو بگاڑتا ہے - بات بات پر اُن کی سرزنش کرنا، اُن کو گھورنا، اُن کی ہر ایک حرکت پر اس طرح غور کرنا گویا وہ چور ہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُن کی بُرائیاں نکالنا — یہ سب کیا ہے؟ محض نوجوانوں کے دِل کو بغاوت پر آمادہ کرنے کا سامان — !

پروفیسر سکھ دیال ——— یہ درست ہوگا - لیکن آپ کو یاد رہے کہ موجودہ سوسائٹی میں ہم اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتے - جبکہ بُرائی کو دلیری کے ساتھ جڑ سے اکھیڑ کر پھینک نہ دیں ؛

پروفیسر - لیکن ہماری درسگاہیں بھی سوسائٹی کی ایک شاخ ہیں -

پرنسپل - اِسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ یہاں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ زیادہ تر ہم لوگوں کی غلط فہمی سے پیدا ہوتی ہیں :

پروفیسر - ہماری غلط فہمی ؟ اگر ہمیں یہ صاف نظر آ رہا ہو کہ فلاں جگہ آگ لگی ہوئی ہو اور وہاں سے شعلے اُٹھتے ہوئے نظر آ رہے ہوں تو ہم یہی سمجھیں گے - کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے ؟

پرنسپل - میرا یہ مطلب نہ تھا میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس آگ کو بجھانے کا کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ آگ بھی بجھ جائے اور کوئی جان بھی نہ تلف ہو -

پروفیسر - وہ طریقہ میں آپ سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ایک ایسا اہم واقعہ ہے جس پر ہماری کالج کی اور یونیورسٹی کی عزت و آبرو کا دارومدار ہے - انسان کے جسم کا کوئی حصہ بالکل گل سڑ جاتا ہے تو اسے کاٹ کر دور پھینک دیا جاتا ہے اور اسی میں بیماری کی شفا تصور کی جاتی ہے - ورنہ اس کا سارا جسم بیکار ہو جائے گا -

پرنسپل - (مسکراتے ہوئے) پروفیسر صاحب آج جبکہ سائنس کی دنیا اس قدر ترقی کر گئی ہے - ایسے ایسے علاج آپ مہیا کر سکتے ہیں کہ جسم کا کوئی حصہ بھی نہ کٹے اور مریض کو بھی صحت ہو جائے -

پروفیسر - خیر! میں آپ سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا - کالج کا ضبط اور انتظام خطرے میں تھا اور ایک ایسا صدمہ پہنچنے والا تھا جو کالج کی تاریخ میں ایک یادگار بن کر رہ جائے - اسی لئے میں نے آپ کو وقت پر اطلاع دے دی - آپ کو پورا اختیار ہے - اس لڑکے کو سزا دیں یا چھوڑ دیں ۔

پرنسپل - آپ ناراض نہ ہو جئے - میں آپ کے مشورے کے سوا

کچھ نہیں کرنا چاہتا۔ صرف صورتِ حالات دیکھتے ہوئے میں اپنا فرض خیال کرتا ہوں کہ اپنی رائے کا اظہار کر دوں۔

پروفیسر ۔ میں آپ کا از حد ممنون ہوں اور میں نے بھی تو آپ کی اور کالج کی عزت کا پاس کرتے ہوئے آپ کو یہ رائے دی تھی۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اس وقت دوسرے کالجوں والے ہم کو کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتے ہیں کہ کوئی ایسی بات انہیں ملے۔ جس پر وہ ہمارا مضحکہ اڑا سکیں اور ہمیں ذلیل کر سکیں۔

پرنسپل ۔ اس بات کی مجھے پروا نہیں۔ اگر ہم خلوص اور صداقت کے ساتھ اپنا کام کرتے جائیں گے۔ تو کوئی ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔

پروفیسر ۔ اگر گستاخی نہ ہو تو یہ عرض کر دوں کہ آپ کو ان باتوں کی پرواہ کرنا ہی ہوگی۔

پرنسپل ۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں مخلوط تعلیم ہے اور اسی وجہ سے اُن کو نکتہ چینی کا موقعہ مل جاتا ہے۔

پروفیسر ۔ مخلوط تعلیم کو میں ذاتی طور پر بُرا نہیں سمجھتا۔ لیکن جو بُرائیاں اس سے پیدا ہو رہی ہوں۔ اُن کی روک تھام نہایت ضروری خیال کرتا ہوں۔

پرنسپل ۔ دیکھئے نا! مجھے اس میں دُکھتی ہوئی بات صرف یہ معلوم

ہوتی ہے کہ ہم اس مسئلے کو بالکل دوسری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ہم نے اخلاق کا معیار اتنا تنگ اور محدود کر دیا ہے۔ کہ بعض اوقات ہمیں خود سمجھ نہیں آتا کہ ہم کیا کریں۔ مقدس فضا پیدا کرنے کا ڈھنگ ہمیں آج تک نہ آیا۔ اگر ہم کھلم کھلا یہ اجازت دیں۔ لڑکیاں لڑکوں سے ملیں جلیں تو —

پروفیسر — (بات کاٹ کر) معاف کیجے گا۔ یہ ایک نہایت خطرناک تجربہ ہے۔ اس ضبط اور مجبوری پر تو یہ حالت ہے اور اگر باگیں ڈھیلی چھوڑ دی جائیں تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ کہ کیا ہوگا؟

پرنسپل۔ میرا مطلب کہنے کا یہ تھا کہ غیر دلچسپ پابندیوں اور لڑکیوں کے معاملہ میں نوجوانوں پر ہر وقت کی چوکیداری خرابی کو روکنے کی بجائے اُسے دوبالا کرتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملیں کھیلیں کودیں۔ معصوم بچوں کی طرح شرارتیں کریں اور پھر آپس میں گھل مل جائیں۔ روحیں ہوں پاک اور مقدس جو اس فضا میں اڑتی پھرتی نظر آئیں اور کبھی کبھی اُن کے ذہن میں بُرائی کا خیال پیدا نہ ہو۔ کچھ اس قسم کی فضا اُن کے لئے پیدا کر دیں کہ خواہ اُن کے جسم ایک دوسرے سے مَس کریں۔ لیکن بدی کا جذبہ مطلق اُن کے ننھے منے دماغوں میں پیدا نہ ہو ؎

پروفیسر۔ آپ نے وہ بات سوچی ہے جو غالباً صرف اس بہشت

میں ہو گی۔ جس کا ذکر ہم صدیوں سے سنتے چلے آئے ہیں۔ اِس مٹی کی دنیا پر اس قسم کی پوِتر فضا کی توقع فضول ہے۔ جناب! جوان عورت اور نوجوان لڑکے کا ایک جگہ اکٹھے ہو جانا ایک طوفان ہے ایک طوفان۔ جس کے بہاؤ کے سامنے مذہب، تمدن، اخلاق سب تنکوں کی طرح بہ جاتے ہیں؛

پرنسپل۔ لیکن میں تو یہی چاہتا ہوں کہ میں اس قسم کی فضا پیدا کر سکوں۔ یہ معصوم بچے اس طرح ہمارے سامنے کھیلیں کودیں جیسے ہمارے گھروں میں ہمارے بچے کھیلتے ہیں؛

پروفیسر۔ جب بچے شرارت کریں تو اُن کو سزا دینا بھی تو آپ کا فرض ہے۔

پرنسپل۔ کیا ہم انہیں اپنے بچوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ کیا ہم نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ اِن بچّوں کی صحیح ذہنی دنیا کیا ہے۔ اِن کی ذہنیتوں اور جذبات کا دھارا کس طرف بہہ رہا ہے۔ کالج سے باہر وہ کیا کرتے ہیں اور کن مصائب سے انہیں دوچار ہونا پڑتا ہے؟ آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ کس کس مشکل سے مقابلہ کرتا ہوا ایک طالب علم تمہارے کالج کے لئے فیس ادا کرتا ہے۔ باہر کی دنیا میں اس کی قیمت کیا ہے اور کس طرح زندگی کے صحیح راستے پر وہ گامزن ہو سکتا ہے۔ کبھی ان باتوں پر بھی آپ نے غور کیا؟

دوسرا پروفیسر - جناب آجکل کے نوجوانوں کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ہم اِس قسم کی کوئی بات پوچھ بھی بیٹھیں تو وہ نہایت بے باکی سے کہہ دیتے ہیں "دیکھئیے پروفیسر صاحب یہ ہمارا پرائیویٹ معاملہ ہے - آپ کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ آپ اِس میں مداخلت کریں" اب وہاں سوائے ندامت کے کیا مِلتا ہے -

پرنسپل - یہ صرف اِس لئے کہ انہیں آپ لوگوں سے ہمدردی کی توقع نہیں ہوتی - بہرحال کشور کا معاملہ میں سوچ رہا ہوں - وُہ ہمارے کالج کا بہترین شاعر ہے جو ہمارے کالج کے لِیے باعثِ فخر ہے - اس کو محض اِس وجہ سے دھکا دے کر باہر نکال دینا کہ وہ ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے - میں مناسب خیال نہیں کرتا ۔

پروفیسر - میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا - لیکن جو کچھ میرے بس میں تھا - میں نے کر دیا - اس وقت میری، آپ کی اور کالج کی عزّت کا سوال درپیش ہے - آپ کشور کو کالج سے نکال دیں یا رکھیں - اِس بات پر آپ کو پورا اختیار ہے - لیکن اگر آپ نے اسے کالج سے نہ نکالا - تو اُس صورت میں آپ کو میرا استعفےٰ منظور کرنا ہوگا -

(یہ کہہ کر پروفیسر سکھ دیال کھڑا ہو جاتا ہے۔ پرنسپل خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے دوسرے پروفیسر بھی حیران نظر آتے ہیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سکھ دیال کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ پروفیسر کچھ کتابیں بغل میں دبا کر باہر نکل جاتا ہے اور سب کی نگاہیں اس کے تعاقب میں لگ جاتی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے)

تیسرا ایکٹ

پہلا منظر

(شام کے چھ بجے کالج ہوسٹل میں کشور کے کمرے کا اندرونی منظر۔ کشور کرسی پر بیٹھا ہے۔ چھوٹی میز پر راجکماری کی تصویر رکھی ہے۔ اس کی نگاہیں تصویر پر جمی ہیں چہرے پر غم کے آثار ہیں۔ جب پردہ اُٹھتا ہے تو اس وقت کشور نہایت رنجیدہ اور غمگین صورت بنائے بیٹھا ہے۔ اور اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے)

کشور۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا والے مجھے اور تمہیں اکٹھا نہ رہنے دیں گے ۔ ۔ ۔ (ایک غمناک وقفے کے بعد) لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ تم مجھ سے جدا نہیں کی جا سکتیں ۔ ۔ ۔ میں نے

پروفیسر کو تمہارے سامنے بُرا کہا تھا۔ اِس لئے تم بھی ناراض ہو گئی ہو گی۔۔۔ اس دِن سے تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔۔۔ کہیں مجھ کو تم نے ٹھکرا تو نہیں دیا؟۔۔۔ میں جانتا ہوں۔ تم ایسا نہیں کرو گی۔۔۔ (گاتا ہے)

پھر مری خوابیدہ اُمیدوں کو جگایا کیوں تھا
دِل جلانا تھا تو دِل تم نے لگایا کیوں تھا
مجھ کو اِس طرح گرانا تھا اگر نظروں سے!
پھر مرے عشق کو سینے میں بسایا کیوں تھا
چاندنی رات میں اُلفت کا سبق دینے کو
مجھ کو راوی کے کنارے پہ بُلایا کیوں تھا
عشق تھا تم کو تو دِل میں اسے پنہاں رکھتیں
اپنا یہ رازِ حسیں مجھ کو بتایا کیوں تھا
مرے سجدوں کے لئے اور ٹھکانے تھے بہت
آستاں اپنا مجھے تم نے بتایا کیوں تھا

(کشور جب اِس گانے کے دوسرے شعر پر پہنچتا ہے۔ تو ایک ایک کر کے پرکاش۔ اعجاز۔ مجید اور رنبیر داخل ہوتے ہیں۔ ہر ایک دبے پاؤں داخل ہوتا ہے اور آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور کشور اپنے دھیان میں گاتا رہتا ہے۔ گانے سے فارغ ہو کر سب دوستوں

کے چہرے غمناک ہو جاتے ہیں۔ جب کشور گانا ختم کر دیتا ہے تو وہ پھر راجکماری کی تصویر کی طرف نم آلود آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اعجاز اس غم انگیز فضا کو بدلنے کے لئے ایک کتاب ہاتھ میں لئے آتا ہے)

اعجاز۔ کشور صاحب! آپ بھی اپنے آپ کو شاعر سمجھتے ہوں گے۔ ذرا ہماری طرف بھی غور کیجئے۔ مابدولت نے ایک عدد کتاب اپنے قلم گوہر بار سے تصنیف کر چھوڑی ہے۔ اور آپ نے ہمیں مبارکباد پیش نہیں کی۔

کشور (سب کے ساتھ مل کر قہقہہ لگاتا ہے) اعجاز صاحب! ہمیں تو یہ علم بھی نہ تھا کہ آپ "صاحب دیوان" ہیں۔

زبیر۔ ... یا یوں کہئے کہ دیوان صاحب ہیں (سب ہنستے ہیں)

اعجاز۔ بس میں اس حماقت کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ تم ہر ہنسنے والی بات پر ہنس دیا کرتے ہو۔ کسی رلانے والی بات پہ ہنسو تو لطف بھی آئے۔ کشور صاحب۔ یہ میں آپ کو بتا دوں کہ میں شاعری واعری کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے میں دیوان صاحب . . . (قہقہہ بلند ہوتا ہے) . . . میرا مطلب تھا کہ صاحب دیوان نہیں ہو سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعری ہوا میں گھوڑے دوڑانے کا نام ہے۔

مجید۔ سبحان اللہ! اس سے بڑھ کر شاعری کی تعریف اور کیا

ہو سکتی ہے!

رہبر۔ اور اگر ہوا میں ہوائی جہاز دوڑائے جائیں تو اسے آپ کیا کہیں گے؟

پرکاش۔ وہ ماڈرن شاعری ہو گی۔

اعجاز۔ عمر بھر تم لوگوں کو سلیقہ نہ آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اچھی بات تمہیں کیوں پسند آجایا کرتی ہے؟

کشور۔ آخر ہم بھی تو سُنیں کہ یہ کتاب کیا ہے؟

اعجاز۔ بس۔ کچھ نہ پوچھو۔

مجید۔ یہ ایک داستان ہے رنج و الم کی .... ایک چیختی ہوئی، گھسٹتی ہوئی، رینگتی ہوئی، اُمڈ ملتی ہوئی پکار ہے۔ ایک مظلوم کی۔ حضرت انسان کے نام۔

کنور سین۔ اجی آپ تو کہتے تھے کہ یہ شعروں کا دیوان نہیں لیکن آپ نے تو اس کی تعریف شعروں ہی کی ہے۔

اعجاز۔ تمہیں کس کم بخت نے کہہ دیا کہ یہ شعر ہیں۔ خدا جانے تم اپنی عقل ہر روز صبح گراؤنڈ میں کیوں چھوڑ آیا کرتے ہو کبھی ہیرے جیسے ہوٹے تازے اور بگڑ دوش انسان بھی شاعر ہو سکتے ہیں۔ البتہ نثر کو تو میں اپنے باپ دادا کا ورثہ خیال کرتا ہوں۔

کشور۔ اچھا یہ تو فرمائیے گا۔ کہ اس کتاب کا نام کیا ہے؟

اعجاز ۔ (کتاب کی طرف دیکھ لو) "حضرت انسان"
مجید ۔ واہ! وا!!
پرکاش ۔ (مسکراتے ہوئے) یہ چھپی کہاں تھی؟
اعجاز ۔ بھلہ شوز فیکٹری، ! یار مجھے تم بالکل اُلو ہی سمجھتے ہو۔
کتابیں پریس میں چھپتی ہیں اور کہاں، پبلشر نہایت نیک طبیعت
آدمی تھا کہنے لگا! مولانا ۔ آپ ابھی کالج میں پڑھتے ہیں
اپنا نام کتاب پہ نہ دیجئے ۔ آپ کے خیالات بھی کچھ آزادانہ
اور قدرے عریاں ہیں ۔ اس لئے فرضی نام چلنے دیجئے ۔
کشور ۔ اس نے فرضی نام کیا رکھا تھا؟
اعجاز ۔ بن مانس ۔
پرکاش ۔ بن مانس؟
مجید ۔ بن مانس؟
کشور ۔ یہ تو اچھا نام نہیں ۔
زبیر ۔ ممکن ہے چہرہ دیکھنے کے بعد پبلشر نے نام تجویز کیا ہو ۔
اعجاز ۔ ارے یار! تم سے تو میری صورت اچھی ہے ۔ کشور
صاحب! آپ نے تو اشتہار پڑھا ہی ہوگا ۔ کہ یہ کتاب
ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی ۔ دروغ بر گردن پبلشر ۔ وہ کہہ
رہا تھا کہ اس قسم کی مزاحیہ کتاب دنیا کی کسی زبان میں نہیں
لکھی گئی ۔

اعجاز - صورت بُری ہو انسان بات تو اچھی کرے -
زبیر - دیکھئے تو میری صورت اچھی ہے اور میں بات بھی اچھی کرونگا -
ہاں آپ کیا کہہ رہے تھے ؟ (اُوپر نگاہ کرکے) چیختی ہوئی،
روتی ہوئی، لنگڑاتی ہوئی پکار . . . . .
اعجاز - روتی ہوئی، لنگڑاتی ہوئی کس گھن چکر نے کہا تھا ؟
زبیر - میرا مطلب تھا - کہ ان لفاظ میں ٹریجڈی ٹپک رہی تھی -
کشور - اعجاز صاحب ! یہ کوئی محبّت کا افسانہ ہے -
اعجاز - اُف - ایک گہری محبّت کا افسانہ، اُف، بندہ نواز -
اِسی لئے تو نام فرضی رکھا تھا - ورنہ آج ہمیں کالج میں کون
رہنے دیتا - کالج کے جمعداروں کو تو آپ جانتے ہی ہیں -
وہ تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے سینے میں دِل نہیں - بلکہ بادشاہی
مسجد کی سیڑھیوں کا کوئی پتھر ہے - وہ نہیں جانتے کہ ہمارا
دِل تو پانچویں جماعت کے بچے کے اسفنج کی طرح ہے - جب
کبھی محبّت کا نام آتا ہے تو تمام پروفیسروں کے پیٹوں میں
چوہے دوڑنے لگتے ہیں *
مجید - یہ محاورہ آپ نے غلط استعمال کیا ہے
اعجاز - اچھّا - بلّیاں دوڑنے لگتی ہیں -
کشور - اعجاز صاحب ! آپ مختصر طریقے پر اپنے اس شاہکار کا
پلاٹ سُنا سکتے ہیں ؟

اعجاز۔ جناب! کیا بتاؤں۔ میں نے اشاروں ہی اشاروں میں
دُنیا کا احوال کہہ سُنایا ہے یہ ایک پکار ہے۔
رنبیر۔ چیختی ہوئی، روتی ہوئی، لنگڑاتی ہوئی۔
کشور۔ رنبیر صاحب! ذرا سُنیئے تو . . .
اعجاز۔ یہ ایک پکار ہے مظلوم کی حضرت انسان کے حضور میں۔
یعنی قصہ ہے ایک بندر اور بندریا کا۔
(اس پر باقی تینوں دوست قہقہے بلند کرتے ہیں)
پرکاش۔ کیا کہا قصہ بندر اور بندریا کا (قہقہہ)
رنبیر۔ یار! پھر تو اُس نے تمہارا نام "بن مانس"
بالکل ٹھیک رکھا ہے۔
مجید۔ قربان جائیے۔ بندر اور بندریا سے مراد مرد اور عورت
ہو گی؟
اعجاز۔ (مجید کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے) ہائے! مُنہ چوم
لوں تیرا۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ دنیا میں عقلمندوں کا خاتمہ
ہو گیا ہے۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ واقعی تمہاری کھوپری میں
مغز باقی ہے۔ کشور صاحب یہ داستان ہے بندر اور
بندریا کی۔
رنبیر۔ اور پکار ہے خدا جانے . . .
اعجاز۔ بس صرف مختصر طور پر اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ جنگل

میں بندر اور بندریا کا جوڑہ مزے سے زندگی بسر کر رہا تھا۔
کہ ایک دفعہ اس طرف سے "بازی گر" کا گذر ہوا۔ اس نے
بندر کو پکڑ لیا اور شہر لے آیا۔ ہم اور تم جیسے مہذب انسانوں
کی تفریح کا سامان بنانے کے لئے اس بازیگر نے بندر سے اپنا
پیٹ پالنا شروع کیا۔ افسانے کے اس مقام پر پہنچ کر میں نے
نئی تہذیب کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں . . . اخیر کے
سین بہت دردانگیز ہیں۔ وہ بندریا اپنے بندر کے فراق
میں زار و قطار روتی ہوئی شہر کی طرف آتی ہے اور اس کی
فریاد . . . اُف، وہ صرف پڑھنے کے قابل ہے۔ ایک مظلوم
کی فریاد جو وہ حضرت انسان کے پاس لے کر آئی۔

کشور۔ بہت خوب، کیسا اچھا خیال ہے۔ آخر میں بندر اور
بندریا مل گئے نا؟

اعجاز۔ مل تو گئے۔ لیکن اب جنگل میں بندر کا دل نہ لگتا تھا۔
وہ ظاہری لباس کا دلدادہ ہو گیا اور بندریا کو ہر روز پیٹنے
لگا (اس پر سب دوست قہقہہ لگاتے ہیں)

کشور۔ اب وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ اعجاز نے جو دلچسپی کا سامان
پیدا کیا ہے میں خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اعجاز۔ اجی میں کس قابل ہوں۔

(چاروں دوست اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو گنو سین

بھاگا ہوا اندر آتا ہے۔ اس کی سانس پھولی ہے وہ سیدھا کشور کے پاس پہنچتا ہے اور اس کا بازو پکڑ لیتا ہے)

کنور سین۔ کشور! غضب ہو گیا۔ کچھ سُنا؟ تمہیں کالج سے نکال دیا گیا۔

رنبیر
مجید
اعجاز
پرکاش
ہیں؟ (بیک آواز)

کشور۔ دوستو۔ گھبراؤ نہیں۔ میں اس بات کی توقع کر ہی رہا تھا۔

رنبیر۔ ایسا ہرگز نہ ہو سکے گا۔

اعجاز۔ میں سارے کالج کو بغاوت پر آمادہ کر دوں گا۔

پرکاش۔ جب تک ہم موجود ہیں یہ نہ ہو سکیگا۔

مجید۔ تمہارے جیسا لائق نوجوان ہمیں پھر میسّر نہیں آ سکتا۔

کشور۔ آپ اس وقت تشریف لے جائیں۔ صبح اس معاملے پر سب بھائی غور کریں گے۔

(پانچوں دوست آپس میں باتیں کرتے ہوئے باہر نکلتے ہیں کشور دروازہ بند کر کے واپس آتا ہے اور میز کے

نزدیک کھڑا ہو جاتا ہے اور تصویر اُٹھا لیتا ہے۔ اور
دو چار لمحوں تک اُسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر انگیٹھی پہ
رکھ دیتا ہے اور تصویر کی طرف غور سے دیکھتا رہتا ہے
اور گاتا ہے)

نکہتِ زلف سے نیندوں کو بسا دے آکر
میری جاگی ہوئی راتوں کو سُلا دے آکر
عشق کو نغمہ اُمید سُنا دے آکر
دِل کی سوئی ہوئی قسمت کو جگا دے آکر
عشق کی چاندنی راتیں مجھے یاد آتی ہیں
عمر رفتہ کو مری مجھ سے مِلا دے آکر
شبِ فرقت پہ مری ہنستے ہیں خندۂ نوُر
مرے قدموں پہ ستاروں کو گرا دے آکر
تیری فرقت میں مرے شعر ہیں کتنے غمگین
مسکراتی ہوئی نظروں سے سنا دے آکر

(جب کشور اپنا گانا ختم کر چکتا ہے تو اپنی چارپائی پہ
اوندھا گر پڑتا ہے - اور دوسرا سین بدلنے کے لیئے
آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(وقت صبح ۹ بجے ۔ کالج میں پرنسپل کے کمرے کے سامنے نوٹس بورڈ پر ایک نوٹس آویزاں ہے جس میں کشور کو کالج سے نکالے جانے کا حکم پرنسپل کی طرف سے صادر ہو چکا ہے۔ پردہ اُٹھنے پر اعجاز اور رنبیر داخل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ نوٹس بورڈ کے نزدیک ٹھہر جاتے ہیں۔ اور نوٹس پڑھنے کے بعد پرنسپل کے کمرے کے سامنے پہنچ جاتے ہیں۔ اسی اثنا میں پرکاش۔ مجید اور کنور سین اور ان کے ساتھ پانچ چھ اور لڑکے بھی آجاتے ہیں اور نوٹس پڑھنے کے بعد پرنسپل کے کمرے کے سامنے پہنچ جاتے ہیں وہ نہایت بے قرار اور بغاوت پر آمادہ نظر آتے ہیں اور قسم قسم کی آوازیں بلند کر رہے ہیں "ہماری فریاد آپ کو سننا پڑے گی" "آپ کشور کو نہیں نکال سکتے" "تھوڑے دن ہوئے آپ نے ہی کہا تھا کہ "کشور پر ہمارا کالج فخر کرتا ہے" ہم تمام لڑکے کالج سے باہر نکل جائیں گے" "دروازہ کھولئے ورنہ ہم توڑ دیں گے" "آپ کو اپنا حکم واپس لینا ہوگا" اسی اثنا میں رنبیر ایک کرسی پر کھڑا ہو جاتا ہے اور عوام کو مخاطب کرتا ہے)

زبیر۔ میرے دوستو! آپ نے نوٹس پڑھ ہی لیا ہے۔ اب آپ کی جمیعت کا امتحان ہے۔ کشور کو کالج سے نکالا جا رہا ہے۔ کس لئے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں۔ کشور جو آج تک کسی گناہ کے نزدیک نہیں گیا۔ اگر اس طرح اس کو باہر پھینک دیا جائے تو کیا تم اس ظلم کو برداشت کرو گے؟

آوازیں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔

زبیر۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم کالج کی عمارت کو گرا کر مٹی کے ساتھ ملا دو۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بزرگوں سے یہ التجا کرو۔ کہ وہ اس معاملہ پر غور کریں۔ اپنے فیصلہ کو ایک دفعہ پھر سوچیں اور ان سے صاف صاف کہہ دو کہ کشور جیسے دوست سے ہم جدائی گوارا نہیں کر سکتے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

آوازیں۔ بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔

زبیر... آج کشور کو بے قصور کالج سے نکالا جا رہا ہے۔ کل تمہارے ساتھ بھی یہ سلوک ہو سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے بزرگ کشور کے دشمن نہیں لیکن ہمیں یہ بھی تو معلوم ہو کہ ایسا موتی ٹھیکری سمجھ کر گلی میں کیوں پھینکا جا رہا ہے۔ آج تمہاری جیت اسی میں ہے کہ کشور کے لئے اپنی جانیں وقف کر دو۔ . . آج تمہاری زندگی کا امتحان ہے۔ . . میں یہ

نہیں چاہتا کہ تم کسی قسم کا تشدد کرو۔ لیکن اپنی روحیں کشور کے ساتھ وابستہ کر دو۔ اگر منت سماجت سے کام نہ چلے تو خاموشی کے ساتھ باہر نکل جاؤ اور اس وقت تک کالج نہ آؤ۔ جب تک کہ ہمارا مطالبہ ۔ ۔ ۔ اور ہماری دلی خواہش پوری نہ ہو جائے۔

(بیشک بیشک کی آوازیں آتی ہیں اور سارے لڑکے پرنسپل کے کمرے کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں اور جوش میں آکر دروازے کے شیشے توڑ دیتے ہیں۔ اس وقت کشور داخل ہوتا ہے۔ لڑکے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کشور، کشور کی آوازیں آتی ہیں)

کشور۔ زبیر۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔

(زبیر بھاگا ہوا کشور کے پاس آتا ہے)

زبیر۔ کشور، ہم تمہیں نہ جانے دیں گے۔

(کشور سر ہلاتا ہوا ہجوم کے پاس آجاتا ہے اور جس کرسی پر زبیر کھڑا تھا۔ اس پر کشور کھڑا ہو جاتا ہے)

کشور۔ پیارے دوستو۔ ذرا صبر سے کام لو۔

آوازیں۔ ہم تم سے جدا نہیں ہو سکتے۔

کشور۔ (خاموش رکھنے کے لئے ہاتھ بلند کرتا ہے) یہ میرا ہی دل جانتا ہے کہ تم لوگوں سے جدا ہو کر میری کیا حالت ہوگی لیکن

کیا کروں۔ میں مجبور ہوں اور تم نہیں جانتے کہ مجھ سے ایک بھاری گناہ سرزد ہوا ہے۔ میرے بزرگ میرے دشمن ہیں انہوں نے جو سزا مجھے دی ہے وہ بالکل درست ہے ۔ ۔ ۔ آہ ! میں قصور وار ہوں۔ اگر مجھے اس قصور کے بدلے پھانسی پر بھی لٹکا دیا جاتا۔ تو میں خوشی سے منظور کر لیتا۔ لیکن یہ تم کیا کر رہے ہو۔ میری محبت کی یہی نشانی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری اس حرکت سے ہمارے بزرگوں کے دلوں کو صدمہ پہنچے گا ۔ ۔ ۔ میں جا رہا ہوں۔ ممکن ہے تم لوگوں سے پھر کبھی نہ مل سکوں۔ لیکن میری روح یہاں ہی رہے گی۔ کالج کی ہر ایک اینٹ سے لپٹی ہوئی رہے گی۔ میں تمہارے درمیان ہی رہوں گا۔ لیکن مجھے اپنے اس جسم کو کالج کی دیواروں سے دور ہی رکھنا ہوگا۔ تم زندہ رہنا سیکھو۔ میں یہاں پر نہ ہونگا لیکن میری روح یہاں رہے گی۔ اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو تم اپنے بزرگوں سے محبت کرنا سیکھو۔ آخر دم تک ان سے محبت کرتے رہنا۔ لاڈلے بچوں کی طرح اُن سے روٹھ جایا کرنا۔ لیکن جلدی ہی وہ تمہیں منائیں گے۔ اس کالج میں تمہاری زندگی کی ابتدا ہوئی ہے۔ تمہاری جوانیاں اس در و دیوار کے سائے میں شگفتہ ہوئی ہیں۔ یہ زمین تمہارے لئے ایک مقدس جگہ ہے اس مختصر سی جگہ میں انسانیت اور ملک کی محبت کے لئے اتھاہ سمندر

موجیں مار رہا ہے اگر یہاں بھی تم تشنہ رہو تو افسوس ہے تمہاری زندگی پر... کل جب تم میدانِ عمل میں قدم رکھو تو دنیا کو معلوم ہو جائے کہ تم وطن کے سچے فرزند ہو۔ اب میں بھرے ہوئے دِل کے ساتھ تم سے رخصت ہوتا ہوں۔

(جب کشور اترنا چاہتا ہے تو راجکماری اندر آتی ہے کشور وہیں کھڑا رہ جاتا ہے۔ اس کی نگاہیں جم جاتی ہیں سارے لڑکے راجکماری کی طرف دیکھتے ہیں وہ کشور کے نزدیک پہنچنا چاہتی ہے۔ لڑکے راستہ دیدیتے ہیں)

کشور۔ راجکماری۔

راجکماری۔ کشور۔

(اس وقت راجکماری کشور کے نزدیک پہنچ چکی ہے۔ کالج کے پروفیسر اور پرنسپل بھی باہر نکل آتے ہیں)

کشور۔ راجکماری تم یہاں کیوں آئی ہو؟

راجکماری۔ جہاں تم جاؤ گے۔ میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔

(کشور مسکرا کر کرسی سے نیچے اُترتا ہے۔ اور پس پردہ ایک گیت شروع ہو جاتا ہے۔ راجکماری اور کشور لڑکوں اور پروفیسروں کے درمیان سے آہستہ آہستہ گزرتے ہیں۔ گیت شروع ہوتا ہے اردگرد کی صورتیں غمناک ہو چکی ہیں سب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں)

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

ایک عجیب پاگل

ایک کھیل

کردار:-

شام لال ——— ایک مفرور پاگل

نریندر ——— ایک مسافر

گارڈ ——— اسٹیشن ماسٹر

منظر

(ایک ٹرین اسٹیشن سے روانہ ہو رہی ہے - انجن نے وسل دی ہے - گارڈ نے بھی سیٹی بجائی - انجن کی دوبارہ وسل - گاڑی آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہے - نریندر چلتی گاڑی میں سوار ہوتا ہے اور اندر دیکھے بغیر کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا ہے - گاڑی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے - شام لال ایک اوپر کے تختے پر لیٹا ہوا ہے - اور نریندر اچانک اسے دیکھتا ہے)

شام لال - آپ کو تکلیف تو ضرور ہو گی - وہ کھڑکی بند کر دیں تو مجھ پر احسان ہو گا۔

نریندر - ضرور! میں نے تو سمجھا تھا کہ اس ڈبے میں کوئی مسافر نہیں۔ (کھڑکی بند کر دیتا ہے) آپ وہاں چھپ کر کیوں بیٹھے ہیں - خیریت تو ہے؟

شام لال - اصل بات تو یہ ہے کہ میں ایک مدت سے ایک مکان

میں بند رہا ہوں۔

نریندر۔ بیمار رہے ہوں گے۔

شام۔ بیمار کہیئے یا کچھ اور لیکن بند ضرور رہا ہوں اور . . . اور صحت تو بالکل اچھی ہے۔

نریندر۔ آپ محتاط آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے بھی اچھے نہیں ہوتے۔ انسان بند کمرے میں رہے تو کوئی بیماری نزدیک نہیں آتی۔ احتیاط بھی کیسی اچھی چیز ہے۔

شام۔ یہ بات بھی نہیں۔ شاید آپ مذاق سمجھتے ہیں۔ کیا بتاؤں اس کی وجہ بھی اس قدر عجیب و غریب ہے کہ . . . کیا بتاؤں۔ آپ سن کے کیا کریں گے؟

نریندر۔ اگر یہ بالکل ذاتی واقعہ نہ ہو تو میں بڑے شوق سے سننے کو تیار ہوں۔ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟

شام۔ میرا نام؟ میرا نام۔ کیا بتاؤں! میرا نام صرف میرا نام ہی ہے۔ جب میں ایک مکان میں بند کیا گیا تو اس وقت میرا نام شام لال تھا۔ اس وقت میں خود نہیں سمجھتا کہ میں اپنا نام کیا رکھوں!

نریندر۔ آپ جائیں گے کہاں؟

شام۔ اس کے متعلق میں نے ابھی کچھ فیصلہ نہیں کیا۔ میں عجیب و غریب انسان ہوں۔ میں آپ سے آپ کا نام نہیں پوچھونگا۔

اِس بات کی بھی آپ کو زحمت نہیں دوں گا کہ آپ کدھر جا رہے ہیں!

نریندر۔ میرا نام نریندر ہے۔ لیکن میں آپ میں بے حد دلچسپی لینے لگا ہوں۔ مسٹر شام لال۔ آپ وہ واقعہ مجھے ضرور بتائیں۔

شام۔ مسٹر... کیا نام بتایا تھا آپ نے ؟

نریندر۔ نریندر۔

شام۔ ہاں۔ مسٹر نریندر! کیا بتاؤں۔ میں ایک ناقابل اعتبار مغالطہ کا شکار ہو گیا ہوں۔ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جبکہ ریڈیو ابھی دریافت نہیں ہوا تھا۔ میں اس وقت ریڈیو میں بہت دلچسپی لینے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ ریڈیو کو میں وجود میں لا رہا ہوں۔ بس دِن رات اسی دھن میں مگن رہنے لگا۔ ... دِن رات ... کیا بتاؤں، لوگوں نے سمجھا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ جب کوئی شخص دنیا کے سامنے کوئی نئی چیز پیش کرتا ہے تو لوگ اسے پاگل ہی سمجھتے ہیں۔ جتنے اوتار اور پیغمبر آئے۔ شروع شروع میں سب کو سڑی سودائی ہی کہا جاتا تھا... سو مجھے بھی دنیا والے پاگل ہی سمجھنے لگے۔

نریندر۔ آپ کو پاگل سمجھنے لگے۔ کس قدر عجیب بات ہے مسٹر شام لال! آپ نے کوئی پاگلوں والی حرکت بھی کی یا یونہی ؟

شام - بس یہی کہ میں ریڈیو کو ایجاد کر رہا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ دنیا والے پاگل ہیں۔ مجھ میں دیوانگی کے کوئی اثرات نہ تھے۔

نریندر - اور ہو بھی کیسے سکتے تھے!

شام - لیکن - مسٹر ... مسٹر ... مسٹر

نریندر - نریندر!

شام - ہاں! مسٹر نریندر! کیا بتاؤں ایک اور بات بھی تھی۔ آپ کوئی خطرہ تو محسوس نہیں کریں گے۔ اگر میں بتاؤں کہ وہ مجھے کس طرح پاگل تصوّر کرتے تھے۔

نریندر - خطرہ؟ ہرگز نہیں۔

شام - بات صرف یہ نہ تھی کہ میں ریڈیو کی ایجاد کے پیچھے پڑا ہوا ہوں۔ اگر صرف یہ خیال ہوتا تو آج انہیں آدھی دنیا کو پاگل خانے میں بند کر دینا پڑتا۔ بات در اصل یہ تھی۔ کیا بتاؤں ... کہ میرا دماغ ریڈیو کا بنا ہوا تھا۔

نریندر - ریڈیو کا بنا ہوا دماغ؟

شام - بالکل - ریڈیو کا بنا ہوا دماغ یا کان، لیکن میرے اندر ایک حس ضرور ہے۔ دیکھئے نا۔ جب ہم یہ مان لیتے ہیں کہ لکڑی کا ایک صندوق ہزاروں میل کا گانا سن سکتا ہے اور انسانی دماغ جس میں ریڈیو سے زیادہ بے شمار رگیں اور تاریں ہیں۔ کیوں نہ سن سکے؟ اس میں کون سی اَن ہونی بات ہے!

نریندر۔ بالکل نہیں۔ آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔
شام ۔ دیکھئے نا۔ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت "ایتھر" میں ان آوازوں کی لہریں برقی طاقت کے ساتھ دوڑ رہی ہیں۔ جو آلہ زیادہ حساس ہو گا۔ وہ ان آوازوں کو پکڑ لے گا۔ اور تم جانو میرا دماغ بہت ہی حساس واقع ہوا ہے۔
نریندر۔ بہت خوب! یہ تو بہت دلچسپ بات ہے!
شام ۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ ہر ایک شخص مشق کے ذریعہ اپنے دماغ کو سدھا سکتا ہے کہ وہ ریڈیو کی لہروں کو محسوس کرے اور آواز سن سکے۔
نریندر۔ بہت خوب پھر تو ریڈیو سیٹ کی ضرورت بھی نہ رہے گی۔
شام ۔ دیکھئے۔ میں آپ کو بتاؤں۔ ریڈیو سیٹ اور انسانی دماغ کی ساخت کا سسٹم ایک ہی ہے۔
نریندر۔ آپ کی دریافت کس قدر عجیب ہے۔ انسانی دماغ ریڈیو سیٹ کا کام دے (قہقہہ) بہت خوب! بہت خوب!! اور محض اسی بنا پہ آپ کو انہوں نے پاگل سمجھا؟
شام ۔ بلکہ مجھے پاگل خانے میں ٹھونس دیا۔
نریندر۔ پاگل خانے میں؟ اُف! کتنا ظلم ہے! آپ اپنے دماغی ریڈیو سیٹ کا وہاں ثبوت دے سکتے تھے۔
شام ۔ کس طرح؟

نریندر - آپ انہیں سارا پروگرام بغیر ریڈیو سیٹ کے سُنا سکتے تھے۔

شام - جو باتیں میں انہیں بتاتا تھا - وہ کہتے تھے کہ کسی پروگرام میں شامل نہیں - بہر حال اُنہوں نے مجھے پاگل خانے میں بند کر دیا -

نریندر - افسوس ہندوستان میں کسی Genius کا پیدا ہونا کتنا گناہ ہے - اگر آپ یورپ میں پیدا ہوتے تو آپ کے دماغ کی کروڑوں روپے قیمت ہوتی -

شام - یا میرے دماغ کو پستول کی گولی سے باہر نکال دیا جاتا -

نریندر - اجی! وہاں تو تاریخ میں آپ کا نام باقی رہ جاتا - قوم آپ پر فخر کرتی اور مرنے کے بعد آپ کے مجسمے کھڑے کئے جاتے اور یہاں آپ کو پاگل خانے میں بند کر دیا گیا . . . اُف! پھر کہتے ہیں کہ ہندوستان کو سوراج کیوں نہیں ملتا -

شام - خیر! اب تو پاگل خانہ سے بھاگ نکلا ہوں -

نریندر - بہت اچھا کیا آپ نے - اب کیا ارادہ ہے ؟

شام - میں چاہتا ہوں کہ اب اپنے دماغی ریڈیو سیٹ کو خوب ترقی دوں -

نریندر - میں نے کہا - کوئی ایسا طریقہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے دماغ کے ساتھ لاؤڈ سپیکر لگا سکیں - مطلب یہ ہے - کہ

ریڈیو کی آواز صرف آپ ہی نہ سُن سکیں۔ دوسرے بھی سُنیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ پروگرام کی آوازیں بے اختیار آپ کی زبان پر جاری ہو جائیں۔

شام۔ دیکھو کوئی نہ کوئی تدبیر نکالوں گا۔

نریندر۔ آپ کون سے اسٹیشن سنا کرتے ہیں؟

شام۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سے اسٹیشن ہوتے ہیں۔ لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ آواز صاف آرہی ہوتی ہے۔

نریندر۔ آپ تو دنیا میں ایک نرالے انسان ہیں!

شام۔ ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔

نریندر۔ کس قدر حیرت انگیز بات ہے۔

شام۔ اور میں اس وقت بھی ایک آواز سُن رہا ہوں۔

نریندر۔ اس وقت بھی؟ پھر تو مجھے خاموش رہنا چاہیئے۔

شام۔ نہیں۔ میں تو بڑے شور شرابے میں بھی آوازیں صاف سن سکتا ہوں۔

نریندر۔ آپ کے خیال میں اس وقت آپ کون سے اسٹیشن کی آواز سُن رہے ہیں؟

شام۔ اس وقت تو ایک معمولی سا اسٹیشن ہے۔ ایک دیوتا کی آواز سُن رہا ہوں۔

نریندر۔ دیوتا؟ آپ کا دماغ واقعی
شام ۔ میرا دماغ بالکل درست ہے۔ اس وقت کوہ ہمالیہ کی چوٹی نانگا پربت سے ایک دیوتا کی آواز میرے کانوں میں آرہی ہے۔
نریندر۔ نانگا پربت؟ عجب تماشا ہے۔ اچھا جی! وہ دیوتا گا رہا ہے یا گفتگو کر رہا ہے۔ گیت کے بول کیا ہیں؟
شام ۔گیت ویت کچھ نہیں۔ وہ تو ہماری تمہاری طرح صاف سیدھی باتیں کر رہا ہے۔
نریندر۔ کیسے خوش قسمت انسان ہو۔ دیوتاؤں کی باتیں سُن رہے ہو اور دنیا کہتی ہے کہ دیوتاؤں کا وجود ہی نہیں ہے اور دیوتا تو عجیب وغریب باتیں کیا کرتے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی سناؤ۔ ان کی باتیں دنیا والوں کی طرح بے معنی تو نہ ہوتی ہوں گی
شام ۔اور وہ قربانیاں بھی مانگا کرتے ہیں۔
نریندر۔ بے شک۔
شام ۔لیکن میں یا آپ اُن پر اعتراض بھی نہیں کر سکتے۔
نریندر ۔ بیشک! بھینٹ مانگنا تو اُن کا دستور ہے۔ لیکن کیا وہ سچ مچ گفتگو کر سکتے ہیں؟ کیا ان کی آوازیں "ایتھر" میں پھیل سکتی ہیں؟
شام ۔کیوں نہیں۔

نریندر - لیکن اکثر وہ کس زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ سنسکرت زبان میں کرتے ہوں گے -

شانم - کبھی سنسکرت، کبھی ہندی، کبھی اردو اور انگریزی میں بھی -

نریندر - انگریزی میں بھی -

شانم - ہاں ہاں ! دیوتا ہر ایک زبان بول سکتے ہیں -

نریندر - بے شک - آخر دیوتا ہوئے - اور اس وقت بھی آپ سن رہے ہیں -

شانم - ہاں ! ہاں !

نریندر - کون سی زبان میں -

شانم - اس وقت - ایں - ایں - انگریزی میں -

نریندر - کس قدر مضحکہ خیز بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے - آپ کے لیے موزوں ترین وہی جگہ تھی - جہاں سے آپ بھاگ کر آئے ہیں -

شانم - یعنی پاگل خانہ - لیکن میں پاگل نہیں ہوں -

نریندر - نہیں - آپ کا کوئی دوش نہیں آپ کے دماغ نے آپکو مصیبت میں ڈال دیا ہے (قہقہہ)

شانم - آپ تو سب بات مذاق میں اُڑا رہے ہیں -

نریندر - اجی ! مذاق کون کر رہا ہے - آپ کی بات تو سولہ آنے

ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں آپ کو اوتار بن جانا چاہیئے۔

شام۔ یہ بات آپ پر ابھی ظاہر ہو جائے گی جبکہ میں آپ کو اپنے دیوتا کے فرمان سے آگاہ کرونگا۔

نریندر۔ دیوتا کا فرمان! یہ ایک اور دلچسپ بات ہے۔ ہم بھی سُنیں۔

شام۔ دیوتا نے مجھے ابھی ابھی حکم دیا ہے کہ میں آپ کو قتل کر دوں

نریندر۔ مجھے؟

شام۔ جی ہاں! آپ کو۔

نریندر۔ آپ کا دماغ واقعی چلا ہوا ہے (قہقہہ)

شام۔ ہنسی مذاق رہنے دیجیئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ دیوتا قربانی مانگا ہی کرتے ہیں۔

نریندر۔ یہ عجیب بات ہے دیکھیئے نا...

شام۔ اور دیوتاؤں کے حکم کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔

نریندر۔ دیکھیئے خاموش رہیئے۔ ورنہ مجھے کوئی اور انتظام کرنا پڑے گا۔ میں نہیں چاہتا۔ کہ گاڑی میں لوگوں کو تماشا دکھاؤں اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ کو واپس پاگل خانے بھجوا دوں۔

شام۔ بیٹھے رہیئے۔ اگر تم نے زنجیر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو مجھے دیوتا کے حکم کو بہت جلد پورا کرنا ہوگا۔

نریندر۔ کیا آپ واقعی اِس بات پر تلے ہوئے ہیں؟

شام ۔ ہاں ! ہاں ! بہت اشتیاق سے ۔

نریندر ۔ کیا سچ مچ . . .

شام ۔ یہ دیکھ رہے ہو تیز دھار والا چاقو ؟

نریندر ۔ (خوف زدہ ہوکر) او ہو ۔ ہو ۔ ہہ

شام ۔ دیکھو نا ۔ دیوتاؤں کا حکم تو ماننا ہی ہو گا ۔ اور تم تو ابھی دیوتاؤں کا مضحکہ اڑا رہے تھے ۔ لیکن مجھے تو اُن کا حکم ماننا ہی پڑے گا ۔

(نریندر اب یہ محسوس کر رہا ہے کہ اسے ایک خطرناک پاگل سے واسطہ پڑا ہے ۔ اس لئے اس نے اپنا رویہ اور لہجہ بدل لیا ہے) (وقفہ)

نریندر ۔ ہاں ! آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں ۔ آپکو دیوتاؤں کا حکم ضرور ماننا ہو گا ۔ لیکن سنئے تو کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کا دماغی ریڈیو سیٹ آج بالکل ٹھیک ہے ؟ میرا مطلب ہے کہ کہیں موسم تو خراب نہیں ؟ آپ کو معلوم ہے کہ موسم کی خرابی کے باعث بہترین ریڈیو سیٹ عجیب بے ہنگم سی آوازیں نکالتے ہیں ۔

شام ۔ لیکن میرا سیٹ کبھی خراب نہیں ہوتا ۔

نریندر ۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ۔ یونہی میرا خیال تھا ۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے ۔ انسان بسا اوقات اِن دیوتاؤں کی باتیں

سمجھ نہیں سکتا۔ وہ کہتے کچھ ہیں اور مطلب ان کا کچھ اور ہوتا ہے۔ دیوتاؤں کے بھید نرالے ہوتے ہیں نا! اگر آپ نے مجھے قتل کر دیا تو وہ سخت ناراض ہو جائیں گے۔

شام ۔ بلکہ وہ بہت خوش ہوں گے۔

نریندر ۔ دیکھئے نا! ... انسان ہر پہلو پر سوچ لے تو اچھا ہے انسان کی عقل کتنی بھی بڑی ہو ۔ دیوتاؤں کی عقل کو تو نہیں پہنچ سکتا ۔ پچھلے دنوں آپ کی طرح کا ایک شخص مجھ سے ملا تھا وہ کہہ رہا تھا ۔ کہ اس سے بھی دیوتا ہمکلام ہوتے ہیں اور وُہ تو کہتا تھا کہ دیوتا انسانوں کا اکثر مضحکہ اڑایا کرتے ہیں ... ... کسی ترنگ میں وہ یونہی ایک حکم دیدیتے ہیں اور دراصل وہ مذاق کر رہے ہوتے ہیں اور ...

شام ۔ لیکن میرے دیوتا کبھی مذاق نہیں کرتے۔

نریندر ۔ ایسا ہی ہوگا ۔ لیکن یہ بات میں تمہیں بتا دوں کہ دیوتا بھینٹ کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔

شام ۔ میرے دیوتا بہت زیادہ پروا کرتے ہیں۔

نریندر ۔ کیا سچ مچ؟ یہ تو بہت دلچسپ بات ہے، اچھا ۔ تو میں بتاؤں ہمیں کیا کرنا چاہیئے، یہ کون سی بڑی بات ہے ۔ ابھی آزمائش ہو جاتی ہے ۔ ہمیں فوراً معلوم ہو جائیگا کہ دیوتا مذاق کر رہا ہے یا واقعی وہ قربانی مانگ رہا ہے۔

شام ۔ میں تو کسی آزمائش کے بغیر اس کے حکم کو پورا کرنا چاہتا ہوں ۔

نریندر ۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ۔ اگر دیوتا میری بھینٹ مانگ رہے ہیں، تو مجھ سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہوگا۔ لیکن ہمیں یہ تو معلوم کر لینا چاہیئے ۔ کہ یہ فرمان واقعی دیوتا کا تھا یا کسی اور کا ! یہ تیز دھار والا چاقو بند کر لیجیے نا۔ . . . میں آپ کو ایک تجویز بتاتا ہوں ۔

شام ۔ کیا ؟

نریندر ۔ آپ اس بات کا انتظار کریں کہ دیوتا اپنے حکم کو تین بار دہرائے ۔ یہ قاعدہ ہے کہ اگر دیوتا اپنے حکم کو تین بار دہرائے تو سمجھ لیجیے ۔ کہ اس کے فرمان کی اطاعت کرنا پڑے گی ۔ ورنہ سمجھ لو کہ وہ مذاق کر رہا ہے ۔

شام ۔ لیکن تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا ؟

نریندر ۔ آخر مجھے بھی یہ راز افشا کرنا ہی پڑیگا ۔ میں آپ سے مذاق تھوڑا ہی کر رہا تھا ؟ میں ان دیوتاؤں کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں اور میں حیران تھا کہ دیوتا نے میری بھینٹ کس طرح مانگی . . . آپ کو شاید معلوم نہیں میرا دماغ بھی انہیں کا بنا ہوا ہے ۔

شام ۔ کیا کہا ؟

نریندر - میں بھی ہمالیہ کے دیوتاؤں کی گفتگو میں سنتا رہتا ہوں۔ اور مجھے ان کا اچھی طرح علم ہے اور تم جانو اِن میں سے اکثر انسانی کمزوریوں کا مضحکہ اڑایا کرتے ہیں۔

شاہم - اس معاملہ میں میرا دیوتا یقیناً سنجیدہ ہے۔

نریندر - ہاں! ہاں!! لیکن ہم آزما لیں تو کیا حرج ہے! اسے تین بار دہرا لینے دو۔

شاہم - اگر میں نے دیوتا کا حکم ابھی پورا نہ کیا - تو مجھ پر عذاب نازل ہو گا۔

نریندر - آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اِس بات کا علم نہیں؟ میں اِن باتوں کو اچھی طرح جانتا ہوں - آخر میں بھی تو ان کی آوازیں سنتا ہوں - میں کبھی یہ گوارا نہ کروں گا - کہ آپ پر عذاب نازل ہو - لیکن ایک دفعہ میری بات بھی تو آزما لو۔

شاہم - اگر میں نے اس کا حکم نہ مانا تو دیوتا سارے سنسار کا نشٹ کر دے گا۔

نریندر - بالکل ٹھیک ہے - لیکن غور کیجئے . . . یہ تو صاف سیدھی بات ہے آپ کہتے ہیں کہ آپ کا دیوتا جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ٹھیک ہے - میں کہتا ہوں کہ دیوتا انسانوں کا اکثر مضحکہ اڑایا کرتے ہیں اور جب تک وہ ایک حکم کو تین بار تک نہ دہرائیں اسے حقیقت نہ سمجھنا چاہیئے اور اگر وہ تین بار دہرا دیں تو یقیناً

وہ کبھی غلط نہ ہو گی۔ میرے خیال میں اگلے اسٹیشن پر ہم گارڈ کو اپنا ثالث مقرر کر لیں کہ ہم میں سے کون درست ہے۔

شامم۔ بالکل نہیں۔ میں کسی تیسرے شخص کو اپنے دیوتا کے احکام میں مداخلت کرنے کی اجازت نہ دوں گا۔

نریندر۔ بہت اچھا! بہت اچھا! جو طبیعت میں آئے کیجئے۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ ہمیں دیوتا کے حکم کا مقصد معلوم ہو جاتا۔

شامم۔ وہ قربانی چاہتا ہے اور اس کا صحیح مقصد یہی ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دیوتاؤں کی زندگی صرف قربانیوں سے برقرار ہے۔

نریندر۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ اگر قربانیاں دینے والے دُنیا میں نہ رہیں تو دیوتاؤں کی ہستی مٹ جائے۔

شامم۔ جس طرح ہم کھانے پینے سے زندہ ہیں۔ اسی طرح دیوتاؤں کی خوراک قربانیاں ہیں . . . بالکل اسی طرح!

نریندر۔ ہم لوگوں نے ہی اُن کی عادتوں کو بگاڑ رکھا ہے۔ میری طرف دیکھو۔ مجھے بھی کئی دفعہ انہوں نے انسانی بھینٹ کا حکم دیا تھا۔ لیکن میں تو اُن کی باتوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ انتظار کیا کہ وہ اپنا حکم تین بار دہرائیں گے . . . لیکن وہ خاموش رہے۔

شامم۔ کچھ بھی ہو۔ مجھے تو قربانی دینا ہی ہو گی۔

نریندر ۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ انسان کا خون کتنا قیمتی ہوتا ہے
اناج کے دانے، لوبان اور تازہ پھول ہی ان کے لئے کافی
ہوتے ہیں ۔ میرے خیال میں اب انسانوں کی قربانی دینے کا
زمانہ نہیں رہا ۔

شاہم ۔ میرا دیوتا صرف انسان کی قربانی سے خوش ہو سکتا ہے ۔

نریندر ۔ لیکن میں آپ سے متفق نہیں ہوں ۔

شاہم ۔ تم کیسے متفق ہو گے! کیونکہ یہ چاقو ابھی تمہارے سینے میں
پیوست ہونے والا ہے ۔

نریندر ۔ نہیں! یہ بات نہیں ۔ میں تو آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں
کہ اگر دیوتاؤں کو میری قربانی کی ضرورت ہے تو زہے نصیب!
ہاں! سنئیے تو، ایک اور بات یاد آگئی ۔ بالکل آسان سا راستہ
آپ کو بتاؤں ۔ ہیں یہ کیا؟ معلوم ہوتا ہے ۔ گاڑی رکنے
لگی ہے ۔

(گاڑی آہستہ ہو رہی ہے)

نریندر ۔ دیکھئے ۔ ابھی گاڑی رکنے لگی ہے اور آپ اپنا کام اتنی
جلدی ختم نہ کر سکیں گے ۔ اور اگر آپ نے اس قسم کی کوئی حرکت
کی تو لوگ آپ کو دیوانہ ہی سمجھیں گے ۔ اسٹیشن نزدیک ہے اور
فی الحال آپ کو اپنے دیوتا کے حکم کو ملتوی کر دینا چاہیئے کیونکہ
کسی نے آپ کو یہ کام کرتے ہوئے دیکھ لیا تو پھر پاگل خانے کی ہوا

کھانی پڑے گی۔ دُنیا تو بیوقوف ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آپ پاگل ہیں۔
اس لئے کہ آپ کو قدرت نے دماغی ریڈیو سیٹ عطا کیا ہے۔
یہ اسٹیشن گذر جانے دیجئے۔ پھر مفصل گفتگو کریں گے۔

شام۔ اچھا! میں تمہاری بات مانتا ہوں۔ لیکن اگر تم اسٹیشن پہ پہنچ کر اپنی جگہ سے اُٹھے یا کسی شخص سے بات کی۔ تو میں فوراً یہ چاقو تمہارے سینے میں گھونپ دوں گا۔

نریندر۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں پاگل تھوڑا ہی ہوں جو کسی سے بات کروں گا۔

شام۔ ہاں! تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ تم جانتے ہو کہ یہ چاقو تو فوراً تمہارا کام تمام کر دیگا۔ لیکن میرا کیا بگڑے گا۔ پاگل خانہ سے بھاگا ہوا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ پھر مجھے پاگل خانہ میں ٹھونس دیں گے۔ یہی ہوگا نا!

نریندر۔ ہاں! ہاں!! ایک دفعہ تو کہہ دیا کہ میں آپ کے متعلق کوئی بات نہ کرونگا۔ میں تو اِن باتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔

شام۔ ٹھیک ہے اب میں اپنی جگہ پر جا کر بیٹھتا ہوں، اور جب اس اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہوگی تو پھر . . میرا مطلب ہے کہ تمہاری زندگی کے صرف پانچ لمحے باقی رہ گئے ہیں۔

نریندر۔ اِس میں کیا شک ہے۔

(گاڑی رُک گئی۔ مسافر اُتر چڑھ رہے ہیں۔ خوانچے

والے آوازیں دیتے گذر رہے ہیں)

شام ۔ دیکھو ۔ گارڈ اس طرف آ رہا ہے ۔ اگر تم نے اس سے پاگل خانے کا ذکر کیا تو تمہاری خیر نہیں ۔

نریندر ۔ او ہو ۔ ایک دفعہ تو کہہ چکا ہوں ۔ میری زبان پر اعتبار کیجئے ۔

شام ۔ قسم کھاؤ ۔

نریندر ۔ میں ایشور کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں آپ کے متعلق آپ کے سامنے کسی سے کچھ بھی نہیں کہوں گا ۔

شام ۔ اب ٹھیک ہے وہ دیکھو گارڈ اُوپر آ رہا ہے ۔

گارڈ ۔ جنٹلمین ! مجھے معاف کرنا ۔ خواہ مخواہ آپ کی گاڑی میں گھس آیا ہوں ۔ ابھی ابھی اسٹیشن پر تار پہنچا ہے کہ ایک دیوانہ لاہور کے پاگل خانہ سے بھاگ نکلا ہے اور انکا خیال ہے کہ وہ اسی گاڑی میں سوار ہوا ہے ۔ کہیں اس قسم کا آدمی آپ کو نظر تو نہیں آیا ؟

شام ۔ گارڈ صاحب ! ہمیں تو کوئی ایسا آدمی نظر نہیں پڑا ۔

گارڈ ۔ لیکن سیٹوں کے نیچے ایک دفعہ جھانک لوں ۔

شام ۔ معاف کرنا ۔ ۔ ۔ لیکن وہ پاگل خطرناک قسم کا ہے ۔

گارڈ ۔ ہاں صاحب ! وہ کہتے تو یہی ہیں ۔

شام ۔ میں نے تو اپنے پاس ایک لمبا سا تیز دھار والا چاقو رکھا

ہوا ہے۔ دیکھئے نا یہ رہا! اگر وہ پاگل یہاں گھس آتا تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ چاقو میں نے دل بہلانے کو رکھا ہوا تھا...؟

گارڈ۔ بیشک آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اگر وہ پاگل آپ پر حملہ کرتا۔ تو آپ چاقو کو ضرور استعمال میں لاتے۔ بہت اچھا کیا۔ آپ نے... جو اپنے پاس چاقو رکھا!

شام۔ شکریہ! میں بزدل تو نہیں۔ البتہ جلدی گھبرا جانے والا آدمی ہوں۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ میں اس چاقو کو ہاتھ میں کھلا ہی رکھوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟

گارڈ۔ نہیں صاحب! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ سیٹوں کے نیچے تو نہیں ہے۔

شام۔ پھر بھی چاقو ہاتھ میں رکھنا چاہیئے۔ کیا خبر وہ پاگل کہیں سے آکودے۔ کیوں نریندر صاحب؟

نریندر۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

گارڈ۔ میں نے آپ کو یونہی تکلیف دی۔ وہ پاگل اس کمرے میں تو نہیں۔ کسی اور ڈبے میں ہوگا۔ تار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سوار تو اسی گاڑی میں ہوا تھا۔

شام۔ اسکا حلیہ معلوم نہیں؟

گارڈ۔ پاگل کا حلیہ کیا ہوگا! وہ کسی سے چھپ تھوڑا ہی سکتا ہے۔

شام۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

نریندر۔ اور اس کا نام ؟
گارڈ ۔ نام بھی تار میں درج نہ تھا ۔
نریندر۔ اور درج کیا تھا؟ ایک پاگل ؟ ارے گارڈ صاحب! آجکل کے پاگل بھی عجیب وغریب ہوتے ہیں۔ اگر وہ ہمارے تمہارے سامنے بیٹھے رہیں تو آپ کو معلوم نہ ہو کہ وہ پاگل ہیں افوہ! بیسویں صدی کے پاگل بھی بڑے سیانے ہو گئے ہیں۔
(شام دیدہ دانستہ کھانستا ہے۔ جس سے نریندر کو تنبیہ کرنا مقصود ہے)
نریندر۔ سردی کے باعث ہمارے دوست کا گلا خراب ہو گیا ہے۔
گارڈ ۔ اچھا! آداب عرض! میں دوسرے ڈبوں میں تلاش کرتا ہوں۔
نریندر۔ ٹھہریئے تو سہی ۔
گارڈ ۔ ابھی بہت سے ڈبے باقی ہیں ۔ گاڑی لیٹ ہو جائے گی ۔ وہ یہاں تو نہیں ہے ؟
نریندر ۔ ہاں وہ یہاں تو نہیں ہے ۔ لیکن کچھ دیر ٹھہریئے تو سہی ۔ ہم دونوں آپ سے مل کر بہت خوش ہوئے ہیں ۔ تھوڑی دیر اور خوش گپیوں میں وقت گذر جائے تو اچھا ہے ۔
گارڈ ۔ خوش گپیوں میں؟ (قہقہہ) آپ کی عنایت کا شکریہ۔ لیکن مجھے جانا ہی پڑیگا ۔ نوکری کا معاملہ ہے ۔ دوسرے گاڑی رکی کھڑی ہے ۔

نریندر - ہاں ! آپ کو تو جانا ہی ہوگا - لیکن سیٹوں کے نیچے ایک دفعہ اور نگاہ ڈال لیں - میرا دوست کہہ رہا تھا کہ وہ بہت جلد گھبرا جانے والا آدمی ہے - اور اس پاگل کا بھی کوئی اعتبار نہیں کہ وہ سیٹوں کے نیچے سے نکل کر اوپر آ بیٹھا ہو -

گارڈ - آپ مذاق کر رہے ہیں (ہنس کر) میں نے تو اچھی طرح دیکھ لیا ہے - یہاں آپ دونوں کے سوا اور کوئی ہے - دوسرے ڈبے دیکھتا ہوں . . . لیجیے - وہ اسٹیشن ماسٹر صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں -

اسٹیشن ماسٹر - کہیے - نہیں ملا ؟

نریندر - اسٹیشن ماسٹر صاحب ! آجکل کے پاگل ہم تم سب کو پاگل بنا دیں گے - یہاں پاگل کا کیا کام تھا - آپ مجھے پاگل سمجھتے ہیں یا میرے دوست مسٹر شام لال کو ؟ وہ دیکھیے کیسی متانت سے بیٹھے ہیں - میں ان کی ضمانت دیتا ہوں -

اسٹیشن ماسٹر - اور آپ ؟ آپ کے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں ؟

نریندر - میرے چہرے پر ؟ دنیا کے رنگ عجیب ہیں ؟ آپ کس خیال میں ہیں - میں کس خیال میں ہوں - اور میرے دوست مسٹر شام لال کسی اور خیال میں ہیں ؟ دراصل دنیا میں زندہ رہنا صرف پاگلوں کا کام ہے - اور

معاملہ بہت ہی خراب ہے!

اسٹیشن ماسٹر۔ معاملہ؟ میں آپ کی کوئی بات نہیں سمجھ سکا۔

نریندر۔ کیونکہ جس پاگل کو آپ تلاش کر رہے ہیں۔ وہ میں ہی ہوں۔

اسٹیشن ماسٹر۔ کیا کہا؟ اسی لئے تمہارا چہرہ فق ہو رہا ہے؟

نریندر۔ چہرہ تو آپ کا فق ہو رہا ہے۔ میں تو پاگل ہوں۔ بالکل پاگل ہوں۔ ذرا طبیعت ٹھیک ہوئی تو پاگل خانے سے بھاگ نکلا۔ وہاں پاگل خانے کے ساتھ ہی ایک باغ ہے ہم وہاں پھولوں کے پودے لگایا کرتے تھے۔ اور مجھے یاد ہے شروع شروع میں تو بہت سے پاگلوں کو ایک ٹوٹی ہوئی لاری میں بٹھا کر باہر کی سیر بھی کرایا کرتے تھے۔

گارڈ۔ یار۔ کیوں ہمیں بیوقوف بنا رہے ہو!

نریندر۔ واہ! حضرت گارڈ صاحب! آپ کو بیوقوف کون بنا سکتا ہے... اسٹیشن ماسٹر صاحب کو... واہ جی واہ! آپ نے بھی کیا کہا؟

اسٹیشن ماسٹر۔ تمہارا نام کیا ہے؟

نریندر۔ میرا نام (قہقہہ) میں چاند کا راجہ ہوں۔ چاند والوں نے میرے خلاف بغاوت کی اور مجھے زمین پر پھینک دیا۔ میں ایک چائے کے "ٹرے" میں آگرا۔ اس میں شراب کے

بلوری کنٹر بھی رکھے ہوئے تھے۔ (قہقہہ)

اسٹیشن ماسٹر - مسٹر گارڈ! میرے خیال میں یہ حضرت وہی ہیں۔

گارڈ - چلیئے راجہ صاحب، آپ کو چاتے کے "ٹرے" میں بٹھا کر واپس بھیجا جائے۔

نریندر - اس میں بلوری کنٹر بھی ہوں گے۔

گارڈ - رنگا رنگ کے۔

نریندر - پھر تو ٹھیک ہے۔ اچھا! میرے ہمسفر صاحب مسٹر شام لال - الوداع۔

شام - دیکھو میں ....

نریندر - نہیں! نہیں! آخر ہم دونوں میں سے ایک کو ہی پاگل خانے میں رکھیں گے، گارڈ صاحب! یہ بہت ہمدرد دوست ہیں۔ انکا نام مسٹر شام لال ہے۔ ابھی یہ آپ سے کہیں گے کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ بیچارے مجھ سے بہت پریم کرتے ہیں۔ لیکن میں تو ان سے نفرت کرتا ہوں۔ کیوں مسٹر شام لال؟

اسٹیشن ماسٹر - چلو تمہیں چاند کی سیر کرائیں۔

شام - اسے مت لیجاؤ۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔

اسٹیشن ماسٹر - آپ کو ضرورت ہے؟

شام - میں نے آپ کو کہا نہیں تھا کہ میں بہت جلد گھبرا جانے والا

آدمی ہوں۔ اِس لئے میں اور یہ سفر میں ساتھ رہیں۔ تو اچھا ہے۔

اسٹیشن ماسٹر۔ لیکن وہ تو پاگل ہے۔

شام۔ نہیں نہیں! وہ پاگل نہیں۔ وہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ اس کا نام نریندر ہے۔ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے ورنہ ساری دنیا تباہ ہو جائے گی۔

نریندر۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ میں چاند کا راجہ ہوں۔ میں پاگل۔ آپ پاگل۔ گارڈ صاحب پاگل۔ اور صرف وہ صاحب پاگل نہیں . . . . وہ مسٹر شام لال، وہ تو بالکل دیوتا ہیں . . . کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ میں ابھی آپ کو چاند کی سیر کراؤں گا۔ ٹھہریئے! ابھی دیوتاؤں کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی ہیں وہ کچھ کہہ رہے ہیں لیکن وہ تو انسانی کمزوریوں کا مضحکہ اڑایا کرتے ہیں۔

اسٹیشن ماسٹر۔ گارڈ صاحب! اِسے لے چلو۔

شام۔ لیکن میں . . . .

گارڈ۔ ہاں! ہاں! اِسے لے چلو۔

(گارڈ۔ اسٹیشن ماسٹر اور نریندر باہر نکلتے ہیں)

گارڈ۔ آخر ہم نے اِسے پکڑ ہی لیا! اسٹیشن ماسٹر صاحب! اب گاڑی چھوڑ دوں؟

اسٹیشن ماسٹر۔ ہاں! آپ لیجا سکتے ہیں۔
(گارڈ سیٹی بجاتا ہے۔ انجن کی سیٹی کی آواز۔ گاڑی حرکت کرنے لگتی ہے)

اسٹیشن ماسٹر۔ آؤ میرے ساتھ خاموشی سے چلے آؤ۔

نریندر۔ چلئے صاحب! میں تو پتھر کی طرح خاموش رہوں گا۔ آپ سے صرف ایک بات کہوں گا۔

اسٹیشن ماسٹر۔ ارے بھائی! باتیں تو تمہارے پاس بہت ہوں گی۔ چاند کے باشندوں نے تمہارے خلاف بغاوت کردی۔ کوئی اِسی قسم کی بات ہوگی؟

نریندر۔ ذرا ٹھہریئے۔
(گاڑی پلیٹ فارم سے چلتی ہوئی نکل رہی ہے)

اسٹیشن ماسٹر۔ اب یہاں ٹھہرنے کا کچھ فائدہ نہیں میرے کمرے کی طرف چلو۔ اس طرف سے اب گاڑی آنے والی ہے۔ اس پر تمہیں سوار کرادیں گے۔

نریندر۔ صرف ایک بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ ذرا گاڑی پلیٹ فارم سے دُور نکل جائے۔

اسٹیشن ماسٹر۔ گاڑی کا کیا مطلب؟

نریندر۔ یہی کہ گاڑی پلیٹ فارم سے دُور ہو جائے۔ تو وہ بات بتاؤں گا۔

اسٹیشن ماسٹر۔ تمہاری گھبراہٹ تو دور ہو چکی ہے۔ بات کیا ہے؟
نریندر۔ اور جب گاڑی سگنل پر سے نکل گئی تو میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔ توبہ! آج تو مرتے مرتے بچا ہوں۔ ایک عجیب پاگل سے واسطہ پڑ گیا تھا۔

(گاڑی تیز ہو چکی ہے)

اسٹیشن ماسٹر۔ کس سے باتیں کر رہے ہو؟ معاملہ کیا ہے؟
نریندر۔ یہی کہ وہ دوسرا شخص پاگل تھا۔ جسے آپ تلاش کر رہے تھے۔
اسٹیشن ماسٹر۔ دوسرا شخص۔
نریندر۔ ہاں! ہاں!! دوسرا شخص۔ جس نے ہاتھ میں ایک فٹ لمبا چاقو سنبھالا ہوا تھا۔ گارڈ کو اشاروں ہی اشاروں میں سمجھایا بھی کہ آجکل کے پاگل ہمارے تمہارے سامنے بیٹھے ہوں تو معلوم نہ ہو کہ وہ پاگل ہیں۔ لیکن گارڈ ایسا کوڑ مغز تھا کہ سمجھا تک نہیں۔ اسے میں نے یہ بھی کہا کہ سیٹوں کے نیچے ایک دفعہ پھر جھانک لو۔ شاید وہ پاگل نیچے سے نکل کر اوپر آ بیٹھا ہو۔ لیکن تمہارا گارڈ تو بالکل کودن تھا۔ معلوم نہیں اس کے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا تھا۔
اسٹیشن ماسٹر۔ اس کے ہاتھ میں چاقو بھی تھا؟
نریندر۔ اجی صاحب! کیا پوچھتے ہو! وہ پاجی دیوتاؤں سے

باتیں کر سکتا تھا اور اسے دیوتاؤں نے حکم دیا تھا کہ وہ چاقو میرے پیٹ میں گھونپ دے۔ وہ تو میں ہی تھا۔ کہ باتوں ہی باتوں میں اسے اسٹیشن تک پھسلا لایا۔ ورنہ آپ کو صرف میری لاش ہی مل سکتی۔

اسٹیشن ماسٹر: اُف!

نریندر: اگلے سٹیشن پر آپ ٹیلیفون کر دیں۔ کمبخت کے پاس چاقو کتنا لمبا تھا۔ اچھا ہوا جو آپ نے نہ دیکھا۔ ورنہ معلوم نہیں وہ کیا کر بیٹھتا۔ فوراً ٹیلیفون کر کے اسے گرفتار کیجیے کیونکہ آج اسے قربانی ضرور دینی ہے اور پھر معلوم نہیں۔ کس بے گناہ کا خون ہو گا۔ جلدی کیجیے۔

(گاڑی دور نکل چکی ہے)

شاعر کا آخری خط

(ایک ڈراما)

کردار:۔

شاعر ـــــــ ظفر

اس کا دوست ـــــ مسعود

اس کی بیوی ـــــ زکیہ

اس کی محبوبہ ـــــ عذرا

ان کے علاوہ ڈاکٹر۔ نرس اور خدمتگار بھی ہیں۔

دورِ حاضر ـــــ وقت چار بجے

منظر

(شاعر کے مکان کا گول کمرہ۔ کمرے کا سارا سامان دورِ حاضر کا پتہ دے رہا تھا۔ ظفر لکھنے والے میز کے سامنے بیٹھا ہے اور اس کے دائیں پہلو میں اس کا دوست مسعود صوفے پر بیٹھا ہوا سگرٹ پی رہا ہے۔ کمرے کے درمیان ایک خوبصورت سا قالین بچھا ہوا ہے اور چاروں کونوں میں ہرن کی کھالیں بچھی ہوئی ہیں انگیٹھی پر عذرا کی تصویر ایک منقش چوکھٹے میں لگی ہوئی رکھی ہے اور اس کے دونوں پہلوؤں میں پھولدان رکھے ہیں جن کے پھول مرجھا چکے ہیں۔ دیوار پر ایک کلاک بھی آویزاں ہے لیکن وہ بند ہے۔ فرش پر کچھ کتابیں اور رسالے

بکھرے پڑے ہیں۔ مسعود دیوار پر غالب، اقبال اور ٹیگور کی تصویروں کو دیکھتا ہے۔ اور پھر اس کی نظر فرش پر پڑتی ہے)

مسعود۔ یہ کیا تماشا ہے۔ بیوی کو اس مکان میں آئے آٹھ دن ہو چکے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اس مکان میں کوئی آیا ہی نہیں۔

ظفر۔ لیکن مجھے یہاں سے نکلے ہوئے بھی تو آٹھ روز ہو چکے ہیں۔

مسعود۔ پھر وہی شاعرانہ گفتگو! اگر کہو تو یہاں سے چلا جاؤں؟

ظفر۔ اگر تمہارے کان اظہارِ حقیقت سے مانوس نہیں تو خدا حافظ۔

مسعود۔ اظہارِ حقیقت! میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں کیا ہو گیا۔

ظفر۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ غور سے سنیں گے تو ممکن ہے آپ بھی سمجھ جائیں۔

مسعود۔ جی ہاں! یہ نطشے کا فلسفہ مجھے آپ کے سوا کون سمجھا سکتا ہے۔ شادی ہوئے آٹھ دن گذر چکے ہیں۔ لیکن آنجناب کے دماغ کی وہی حالت تھی۔ سوائے عذرا کی تصویر کے کمرے کی کوئی چیز صاف نہیں۔ بندۂ خدا! ابھی تمہاری زندگی کی ابتدا ہوئی ہے۔ ابھی تمہیں دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ آنے والی نسل کی تمہارے ساتھ کیا کیا اُمیدیں وابستہ ہیں۔ تم ابھی نوجوان ہو۔ لیکن ملک کی مجلس شعرا نے تمہیں

ملک الشعرا کا خطاب دے رکھا ہے۔ آج ملک بھر میں تمہاری شاعری کا چرچا ہے۔ کیا تمہیں اس قسم کی باتیں زیب دیتی ہیں۔

ظفر۔ (مسکرا کر) معلوم ہوتا ہے کہ تم ناراض ہو گئے ہو۔ لیکن تمہیں کیسے کہوں مسعود۔ کہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ کاش تم اتنا سمجھ سکتے کہ میرا زندہ رہنا میری زندگی کی دلیل نہیں (حقارت آمیز لہجہ میں) اونہہ میں شاعر ہوں، ناکام شاعر۔۔۔ میری شاعری ہیچ ہے۔ مسعود۔ میں پُرخار وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ شعر کہہ کر لوگوں کو دھوکا دیتا رہا۔ آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ میری شاعری کی ابتدا عذرا سے ہوئی تھی۔ اس نے مجھے شعر میں جان ڈالنے کا فن سکھایا۔ لیکن اس کے نہ ہونے سے میں سمجھتا ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔۔۔ میں کچھ بھی نہیں مسعود!

مسعود۔ ظفر، اس دنیا میں ہر شخص کی ہر ایک خواہش پوری نہیں ہوا کرتی۔ آج دنیا نے تمہیں اعزاز بخشا۔ تمہیں آنکھوں پر بٹھایا۔ سوسائٹی۔۔۔

ظفر۔ میں سوسائٹی کو خوب جانتا ہوں۔ وہ لوگ میری انفرادی زندگی کو نہیں سمجھتے۔ میری اجتماعی زندگی کو اُٹھائے پھرتے ہیں۔ اگر میں معاشرتی جانور نہ ہوتا۔ تو کوئی شخص میری طرف متوجہ نہ ہوتا۔ میں شاعر ہوں۔ یہ میری اجتماعی زندگی ہے۔ میں عذرا سے

محبت کرتا ہوں یہ میری انفرادی زندگی ہے - میں اپنی انفرادی زندگی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں ۔ ۔ ۔ دنیا مجھے میری اجتماعی زندگی کے سبز باغ دِکھا کر مجھے بیوقوف بنانا چاہتی ہے لیکن ہیں نے اپنی زندگی کو صرف عذرا کے لئے سنبھال کر رکھا ہُوا تھا - اب وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں -

مسعود - نئی دلھن پر رحم کرو ۔ ۔ ۔ خدا کے واسطے اس پر رحم کرو - گذرے ہُوئے واقعات کو بھُول جاؤ ۔ ۔ بھول جاؤ اپنی جوانی کی نادانیوں کو ۔ ۔ ۔

ظفر - ۔ ۔ ۔ بھول جاؤں ؟ نادانیوں کو ؟ کس قدر نادان ہو تم مسعود! انہیں نادانیوں پر میری زندگی کی بنا ہوئی - عذرا نے مجھے زندہ رہنا سکھایا ' زندگی کیا ہے ؟ اس راز سے آگاہ کیا - آج اسے بھول جاؤں - اِس لئے بھُول جاؤں کہ ایک غیر عورت کا حق تلف ہو رہا ہے - اِس لئے کہ ایک ایسی عورت کو جس کو میں جانتا تک نہیں - میرے ہی منڈھ دی گئی ہے - کاش! تم جانتے کہ عذرا کیا ہے - تم کیا میرا باپ بھی اس ہوتی کو نہ پوچھ سکا - اور ایک اجنبی عورت کو میرے گھر میں داخل کر گیا -

مسعود - اب وہ اجنبی نہیں بلکہ تمہارے ہی جسم کا ایک حصّہ ہے شادی سے پہلے وہ تمہارے لئے ایک اجنبی تھی - لیکن آٹھ دِن سے وہ تمہاری اپنی ہو چکی ہے -

ظفر۔ آٹھ دِن، صرف آٹھ دِن۔ جو چیز دس سال سے میری اپنی تھی۔
وہ صرف آٹھ دِن میں کیسے اجنبی ہو سکتی ہے!

مسعود۔ عذرا تمہارے قابل نہ تھی۔
ظفر۔ لیکن دراصل میں عذرا کے قابل نہ تھا۔ لیکن کیوں؟ اس لئے کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ کیا اِتنی بات کافی نہ تھی کہ وہ دس سال سے میری تھی۔ اِس دس سال میں میرے نغمات صرف اسی کے لئے فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ وہ میرے شعر و سخن کی ملکہ تھی۔ ... آہ! لیکن آج میرا ساز ٹوٹ چکا ہے۔ سوسائٹی کا منشا یہی تھا۔ کہ میں اپنا ساز توڑ دوں ... ٹوٹے ہوئے تار تمہیں نظر نہیں آتے؟ ...
مسعود۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تمہیں عذرا سے محبت ہے۔ لیکن اس وقت تم تصوّر کرو۔ گویا تمہیں کسی زمانے میں عذرا سے محبّت تھی۔ اُف زکیہؔ کیسی اچھی لڑکی ہے۔ جب سے میں نے اُسے دیکھا ہے۔ ہر وقت تعریف کرنے کو دِل چاہتا ہے۔
ظفر۔ ... یہ کس طرح تصوّر کروں۔ وہ میری منتہائے نِگاہ تھی۔ میری دنیا اسی کے ارد گرد گھوم رہی تھی۔ آہ! میں زکیہؔ کو بُرا بھی تو نہیں کہہ رہا۔

مسعود - لیکن اب تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ یہ بات قدرت کو بھی منظور نہ تھی . . . .

(ناظرین کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جس وقت یہ دونوں دوست آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اسوقت عذرا بستر مرگ پر پڑی تھی۔ مسعود کے آنے سے پیشتر ظفر نے اپنی محبوبہ کے نام آخری خط لکھا - وہ خط ابھی تک کھلا ہی میز پر رکھا تھا)

ظفر - . . . قدرت میرے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی - کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسی عزیز چیز کو موت مجھ سے چھین سکتی ہے - اس کا جسم میری نگاہوں سے اوجھل کیا جا سکتا ہے - لیکن روح نہیں ، موت کو اپنی ناکامی پر پشیمان ہونا پڑے گا -

مسعود - ہاں اگر تمہارے احساسات کو اسی طرح تسلی ہو سکتی تھی - تو مجھے اعتراض نہیں -

ظفر - احساسات کو نہیں بلکہ میری حقیقی زندگی کو - مسعود! میں نے عذرا کے نام ایک آخری خط لکھا ہے - وہ تمہیں سنانا چاہتا ہوں -

مسعود - مجھے زیادہ مسرت اس بات میں ہوتی - اگر تم زکیہ کے نام پہلا خط لکھتے - اور مجھے سناتے -

ظفر - تم تو بہت حساس ہو گئے ہو - خیر سنو - لیکن اس سے پیشتر . . .

(اپنی کرسی سے اُٹھتا ہے اور اپنی الماری سے شراب کی بوتل اور گلاس نکالتا ہے۔ اور لکھنے والی میز پر رکھ کر پھر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

مسعود۔ یہ پھر شروع ہوگئی۔ جلدی سے کہہ دو کہ غم غلط کر رہا ہوں

ظفر۔ بند کب ہوئی تھی اور یہ تم سے کس نے کہا کہ اس سے غم غلط ہوتا ہے۔ میں تو اس لئے پیتا ہوں کہ رنج و غم کی انتہائی منزلوں میں پہنچ جاؤں ... اتنا گیا گذرا تو نہیں کہ وُہ عزیز غم جو مدت کی جدوجہد کے بعد پیدا کیا ہے اسے غلط کرنے کی کوشش کروں۔ ہاں تو سُنو! ... "مرے خزاں دیدہ پھُول"!

(خدمتگار داخل ہوتا ہے اور ظفر سے مخاطب ہوتا ہے)

خدمتگار۔ حضور تین چار دوست آپ سے ملنے آئے ہیں اُن کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار بھی ہیں۔ کہتے ہیں۔ ہم آپکو ملک الشعرا بننے پر مبارکباد پیش کریں گے۔

ظفر۔ اُن سے کہہ دو کہ مجھے اس وقت فرصت نہیں۔

خدمتگار۔ بہت اچھا حضور! (باہر نکل جاتا ہے)

ظفر۔ تمہاری سوسائٹی کی ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ یہ لوگ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں ان سے نہیں ملا۔ آئی دفعہ تو میری تعریفوں کے پل باندھ رہے ہوں گے۔ لیکن معلوم نہیں۔

جاتے ہوئے کیا کہیں گے۔

"گدھا کہیں کا۔ ملک الشعرا بن کر بڑا آدمی ہو گیا ہے"
"دیکھو یار ہم سے ملنا بھی اب اس کی توہین ہے" "میں
نہیں سمجھتا کہ اسے ملک الشعرا کیوں بنا دیا گیا ہے"
"اس کے شعر تو بالکل پھیکے اور بے معنی ہوتے ہیں"..
... یہ ہے ہماری سوسائٹی! اگر ہم معاشرتی جانور نہ ہوں تو
ہمارے آرٹ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ خیر... میرے
خزاں دیدہ پھول! مدت سے یہ آرزو تھی کہ مجھے اجنبیت
کا احساس ہو۔ اب تمام رنگینیوں کے باوجود میں اجنبیت
کو محسوس کر رہا ہوں۔

مسعود۔ لیکن ان لوگوں سے تمہیں مل لینا چاہیئے تھا

ظفر۔ تم فکر نہ کرو (شراب کی چسکی لیتا ہے)

(خدمتگار داخل ہوتا ہے)

خدمتگار۔ حضور چائے تیار ہے۔

ظفر۔ ہاں (مسعود کی طرف اشارہ کر کے) آپ کے لئے چائے
لاؤ۔

مسعود۔ لیکن میں تمہارے بغیر چائے نہیں پیوں گا۔

ظفر۔ دو چیزیں بیک وقت نہیں پی جا سکتیں (خدمتگار سے) آپ
کے لیئے چائے لاؤ۔

خدمتگار - بہت اچھا حضور! (باہر چلا جاتا ہے)

ظفر - (خط پڑھتا ہے) گو تمہیں ان باتوں سے کچھ تعلق نہیں۔ لیکن اس دنیا کی نادانیاں تمہیں نہ بتاؤں۔ انہوں نے مجھے ملک الشعرا بنا دیا اور میرا نام تمہارے نام کے بغیر آسمان کی طرف اچھالا۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ میری زندگی صرف عذرا ہی سے وابستہ ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ عذرا کے بغیر میں ایک بیکار سا متحرک بُت ہوں۔

(خدمتگار چائے لے کر آتا ہے۔ ظفر اس وقت تک خاموش رہتا ہے جب تک کہ خدمتگار چائے مسعود کے سامنے رکھ کر باہر نہیں نکل جاتا)

ظفر - (خط پڑھتا ہے) ایک دِن تم نے میری پیشانی ... (مسعود کھڑا ہو جاتا ہے۔ عقبی دروازہ سے زکیہ داخل ہوتی ہے زکیہ میانہ قد کی حسین لڑکی ہے اور چہرے پر معصومیت برس رہی ہے۔ ظفر مسعود کی طرف دیکھتا ہے۔ زکیہ ٹھٹک کر دروازے میں ہی کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس دروازے کی طرف ظفر کی پیٹھ ہے۔ وہ مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ صرف یہ دیکھ رہا ہے کہ مسعود گھبرایا ہوا معلوم ہوتا ہے)

مسعود! آپ آ ... آپ ... تشریف لائیے،

(زکیہ آہستہ آہستہ آتی ہے۔ اور ظفر کے پیچھے ایک

کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

مسعود۔ آپ ادھر تشریف لے آئیے۔

زکیہ۔ شکریہ۔ میں یہیں بیٹھوں گی۔

(ظفر کرسی کا رُخ بدل لیتا ہے اور اپنی پشت میز کی طرف کر لیتا ہے۔ خط اس کے ہاتھ میں ہے)

مسعود۔ بہن۔ ظفر صاحب شکایت کر رہے تھے کہ ہمارے کمرے کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیتا۔ دیکھو نا۔ کس کس پرسی کی حالت میں ہے۔

زکیہ۔ لیکن ان کا ارشاد تھا . . . .

ظفر۔ زکیہ! یہ شکایت دراصل مسعود صاحب کی ہے۔ ہاں تو وہ خط سُنو۔

مسعود۔ اس وقت نہیں پھر سہی۔

ظفر۔ غالباً تم یہ سمجھتے ہو کہ زکیہ کو یہ خط سُن کر رنج ہو گا۔

زکیہ۔ نہیں مجھے رنج تو نہیں ہو سکتا البتہ آپکو رنج ہوا تو مجھے بھی ہو گا۔

ظفر۔ زکیہ۔ یہ خط نہیں بلکہ ایک داستان ہے۔ دو ٹوٹے ہوئے دِلوں کی . . زمانے نے انہیں اکٹھا نہ ہونے دیا۔ . . . . ایک شخص ایک لڑکی سے دس سال محبت کرتا رہا اور اسی کے حُسن و عشق کے گیت گاتا رہا۔ آخر کار وہ اسے نہ مل سکا . . . یعنی . . وہ مر گئی۔ اسے ایک افسانہ ہی سمجھو۔ اگر اجازت ہو تو پڑھ کر سناؤں۔

زکیہ۔ خوشی سے۔

ظفر۔ مسعود میں کہاں پڑھ رہا تھا۔ ہاں (پڑھتا ہے) ایک دن تم نے میری پیشانی سے میرے تیور اپنی سفید انگلی سے مٹانا چاہے تھے۔ تم نے کہا تھا "یہ تیور میری حسرتناک زندگی میں زہریلے سانپوں کی طرح دکھائی دے رہے ہیں" مجھے وہ الفاظ نہیں بھول سکتے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں نے تم سے محبّت کی اور اپنا سب کچھ تم پر نچھاور کر دیا۔ کیوں نہ کرتا؟ رُوح بن کر تم میری رگ رگ میں سما گئیں۔ میرے گیتوں میں تمہاری والہانہ صدا بلند ہو رہی تھی۔ لوگوں نے بھی اسے سُنا۔ لیکن انہوں نے صرف آواز ہی کو سُنا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ آواز کس کی ہے۔ اگر مجھ سے آج کوئی پوچھے کہ تمہاری عمر کتنی ہے تو میں کہوں گا "دس سال"۔۔۔ میری اور تمہاری محبّت کا عرصہ صرف دس سال ہے۔۔۔ اور وہی میری عمر ہے۔۔۔ باقی کچھ نہیں۔۔۔ سانس لینے کو میں زندگی تصوّر نہیں کرتا۔

زکیّہ۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ یہ واقع ہے یا افسانہ؟

مسعود۔ بالکل افسانہ۔ اِس میں رتی بھر صداقت نہیں۔

ظفر۔ اسے افسانہ ہی سمجھو۔۔۔ (وقفہ) لیکن یہ افسانہ نہیں۔ یہ آخری خط ہے عذرا کے نام میری طرف سے۔۔۔ ایک ناکام شاعر کی طرف سے (زکیّہ چونک اٹھتی ہے) یہ تو تمہیں معلوم

ہی ہوگا کہ میں عذرا سے محبت کرتا ہوں۔ لیکن تمہیں اس خط سے معلوم ہوگا کہ دو پاک روحیں کس بیدردی کے ساتھ پامال کر دی گئیں۔

مسعود۔ کیا فضول بک رہے ہو۔ زکیہ بہن، یہ صرف انکی شاعرانہ باتیں ہیں۔

ظفر۔ مسعود صاحب صرف اِس لئے کہہ رہے ہیں کہ تمہارے دل کو دُکھ نہ پہنچے۔ اور میں تم سے اِس لئے صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ بعد میں تمہیں تکلیف نہ ہو۔

مسعود۔ لیکن اس راست گوئی کا یہی وقت تھا؟

ظفر۔ اِس سے بہتر کوئی موقع نہ ہو سکتا تھا۔ زکیہ کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ میں کون ہوں، مجھے کس عورت سے محبت تھی؟ محبت ہے۔ میری دنیا میں بہشتیں لہلہاتی تھیں۔ میں نے ایک حورِ فردوس کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ پھر وہی دُنیا میرے لئے دوزخ بن گئی۔ کس لئے؟ کیونکہ مجھے اِس دنیا میں دنیا والوں کے دوش بدوش رہنا تھا۔ ذرا سُننا۔ خط میں ایک جگہ میں نے اشارہ کیا ہے ... (ورق اُلٹ کر) یہ رہا ... (خط پڑھتا ہے) آج سے ایک سال پہلے جبکہ مجھے ... اور تمہیں بھی یقین ہو گیا کہ ہم دُنیا کے سامنے ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتے۔ تو تم نے کہا تھا "آج سے میں یہ سمجھ لوں گی کہ میری زندگی میرے راستہ

میں ایک رکاوٹ ہے - اور اس رکاوٹ کو مجھے دُور ہی کرنا پڑے گا"! کتنی گہری صداقت تھی اِن الفاظ میں! ... تم مجھ سے جُدا ہو کر چلی گئیں تو میں نے سمجھا کہ میری دُنیا بدل گئی۔

(خدمتگار پھر داخل ہوتا ہے۔ ظفر خاموش رہتا ہے۔ جب تک کہ وہ چائے کے برتن اُٹھا کر باہر نہیں نکل جاتا)

ظفر - (زکیہ سے) اگر تمہیں اس خط میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی تو تم بلا تکلّف جا سکتی ہو۔

زکیّہ - میں اِس خط کو نہایت غور سے پڑھ رہی ہوں۔

ظفر - (چند سطور چھوڑ کر پڑھتا ہے) جزیرۂ خواب میں دو معصوم رُوحوں نے مِل کر ایک محل تیار کیا۔ اُس محل پر جنّت کی آبادی بھی رشک کرتی تھی۔ یک لخت مغرب کی طرف سے ایک بھرا ہوا طوفان اُٹھا - وہی لہریں جو کل تک گیت گاتی ہوئی آتی تھیں۔ اور اُن معصوم روحوں کے پاؤں چوم کر لوٹ جاتی تھیں۔ خشمگیں ہو گئیں اور اس محل کو خاشاک کی طرح بہا کر لے گئیں۔

مسعود - ظفر! اِس میں سوائے شاعری کے اور کیا ہے؟ مجھے یہ علم نہ تھا کہ تم تخیلی دُنیا کے اِس قدر پروانے ہو جاؤ گے۔ اب تم زندگی کی حقیقتوں سے دوچار ہو رہے ہو۔

ظفر - تم میں اور مجھ میں فرق اتنا ہے کہ جسے تم تخیلی دُنیا کہتے ہو۔ میں اُسے حقیقت سمجھتا ہوں۔ خیر یہ بحث لمبی ہو جائے گی۔ یہ خط

بہت طویل ہے۔ لیکن میں اس کے ضروری حصے آپ لوگوں کو سُنانا چاہتا ہوں۔

زکیہ۔ لیکن میری یہ خواہش ہے کہ آپ ہمیں سارا خط سُنائیں۔

ظفر۔ اچھا۔ اسی طرح سہی۔ (پڑھتا ہے) مجھے وہ دِن اچھی طرح یاد ہے آج سے ایک برس پہلے جب تمہیں یہ علم ہو گیا کہ دو روحوں کا قصرِ محبت طوفانی لہروں کی نذر ہو چکا ہے۔ تو تم کیسی گہری سوچ میں پڑ گئیں۔ اُس وقت تمہیں کھانسی کے ساتھ خون آیا۔ وہ خون تم نے مجھ سے چھپا لیا۔ لیکن تم میز پر اپنا خون آلودہ رومال چھوڑ گئی تھیں۔ اس خیال سے کہ میں کانپ اُٹھوں گا۔ کانپتا ہوا تمہارے پاس آؤں گا۔ گھبراہٹ سے میرا رنگ زرد ہو جائیگا۔ لیکن میں خاموش رہا۔ گویا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ۔ ۔ اس دِن کے بعد تم اپنے راستے کی رکاوٹ کو دُور کرنے کے لیے گناہ کی وادی میں کود پڑیں۔ تم اپنی ہستی کو بھول جانا چاہتی تھیں۔ ۔ ۔ دُنیا بھی بھُول چکی تھی۔ تم بسترِ مرگ پر تھیں اور تمہیں یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ اِس لئے تم نے مناسب سمجھا کہ میں اس رکاوٹ کے دُور ہونے کا منظر دیکھوں۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ زکیہ میری بیوی ہے۔ کیا تمہیں بھی اس بات کا یقین ہے لوگ نہیں سمجھتے کہ زکیہ میرے لئے ایک غیر عورت ہے۔ اور ہم ایک چھت کے نیچے رہ کر بھی عمر بھر بیگانہ ہی رہیں گے۔ اس میں زکیہ

کا کوئی قصور نہیں ۔لیکن وہ واقعہ کیسے بھول جاؤں ۔ جبکہ ہم
دونوں کا قصر محبت مسمار ہوا تھا ۔ رُوح کی ۔ ۔ ۔
(زکیہ بے اختیار زار و قطار روتی ہے اور گرتی پڑتی
کمرے سے باہر نکل جاتی ہے ۔ ظفر مسعود کی طرف دیکھتا
ہے اور مسکرا دیتا ہے)

مسعود ۔ تم مسکرا رہے ہو (غضبناک ہو کر) ایک معصوم رُوح کو کچل
رہے ہو ۔ ایک بیگناہ عورت کا کلیجہ چھلنی کر رہے ہو ۔ اگر تمہیں
عذرا سے محبت ہے ۔ تو یہ تمہارا انفرادی فعل ہے ۔ بیچاری زکیہ
کو کیوں گھسیٹ رہے ہو ۔ ایک بے قصور انسان کو رلانے
سے کیا حاصل ؟

ظفر ۔ بس زکیہ کے ایک دفعہ رونے پر تم اتنے غضبناک ہو گئے ۔ تم
نہیں جانتے ۔ کہ عذرا اس ایک سال کے عرصہ میں کتنی بار روئی
ہو گی ۔ روتے روتے اس کی آنکھوں کے چشمے خشک ہو گئے
ہوں گے ۔ خدا کی ساری کائنات اس کے ساتھ روتی ہو گی ۔
زکیہ کو رونا ہی چاہیئے ۔ کم از کم عذرا جتنا تو رونا چاہیئے ۔

مسعود ۔ بس حد ہو گئی ۔ ایک بے گناہ روح کو پامال کر رہے ہو ۔
اور پھر لطف اندوز بھی ہو رہے ہو !

ظفر ۔ آج عذرا سے بڑھ کر بے گناہ مجھے دُنیا میں کوئی ہستی نظر نہیں
آتی ۔

(ظفر خط پڑھنے کا ارادہ کرتا ہے۔ تو اس وقت خدمتگار ہاتھ میں ایک کاغذ لئے اندر آتا ہے اور ظفر کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ ظفر ایک لمحہ میں اس کاغذ کو پڑھ جاتا ہے۔ اور اس کا رنگ آنِ واحد میں زرد ہو جاتا ہے۔ وہ آخری خط کو احتیاط سے لفافے میں بند کرتا ہے۔ اور کھڑا ہو جاتا ہے۔ مسعود کے چہرے پر حیرت کے آثار ہیں)

ظفر۔ ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ عذرا کا آخری وقت قریب ہے۔ آپ آ سکتے ہیں (نہایت بلند آواز سے) آخری وقت۔ کس کا؟ عذرا کا؟ موت سمجھتی ہو گی کہ میں عذرا کو ظفر سے چھین لوں گی۔ تو قصہ تمام ہو جائیگا۔ یہ موت کی غلط فہمی ہے (اسی اثنا میں ذکیہ بھی سہمی ہوئی دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئی ہے) عذرا! موت تم کو مجھ سے کبھی نہیں چھین سکتی۔ تم دنیا کی نظروں میں مر جاؤ گی۔ لیکن ظفر کی نظریں اس دنیا سے اٹھ کر تمہیں آسمانوں کو چیر کر دیکھا کریں گی۔ تم میری ہو۔۔۔ عذرا، تم میری ہو۔ (گر پڑتا ہے)

(دوسرا منظر بدلنے کے لئے پردہ نیچے گرتا ہے۔ لیکن ایک منٹ کے بعد پھر اٹھتا ہے۔ اور تماشائیوں کے سامنے ہسپتال کے ایک وارڈ کے برآمدے کا منظر

ہے۔ ظفر، مسعود اور زکیہ داخل ہوتے ہیں۔ وارڈ کے دروازے سے ڈاکٹر باہر نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور وہ ملاقاتیوں کے پاس آتا ہے)

ڈاکٹر۔ مریضہ کی خواہش ہے کہ وہ آپ سے اِسی جگہ ملاقات کرے۔ آپ یہیں ٹھہرے رہیں۔

(ڈاکٹر جس دروازے سے آیا تھا۔ پھر اُسی سے باہر نکل جاتا ہے۔ زکیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ مسعود زکیہ کو تھامنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ظفر خاموش ہے۔ اِتنے میں دو نرسیں عذرا کو سنبھالے ہوئے داخل ہوتی ہیں۔ عذرا ایک مشت استخواں ہے۔ لیکن آنکھوں کی چمک میں وہ پہلی سی محبّت عود کر آئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھولوں کا ہار ہے دُور سے وہ زکیہ کو دیکھتی ہے تو ٹھٹک جاتی ہے پھر آہستہ آہستہ اُسے نزدیک لایا جاتا ہے)

عذرا۔ ... آپ آ گئے؟ اب میں مرنا نہیں چاہتی اور (زکیہ کی طرف اشارہ کرکے) آپ کون ہیں؟ ... آہا، میں سمجھ گئی۔

ظفر۔ یہ میری بیوی زکیہ ہے اور یہ میرے دوست مسعود ہیں۔ میں نے تمہیں دُکھ دیا اور ...

عذرا۔ (بات کاٹ کر) زکیہ بہن! آپ اچھی تو ہیں! ظفر! تم

بہت خوش قسمت ہو۔ کہ تمہیں ایسی حسین بیوی ملی۔

ظفر۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میں ۔ ۔ ۔ ۔

عذرا۔ زکیہ بہن، ان کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ اپنے شاعرانہ تخیل میں ایسی بہکی بہکی باتیں کر جایا کرتے ہیں کہ ان پر بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔

زکیہ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن بہن۔ میں سب کچھ سُن چکی ہوں۔ کاش میں پیدا نہ ہوتی اور اگر پیدا ہوئی تھی تو عذرا ہوتی۔

عذرا۔ اپنے لئے کیسی بُری دُعا مانگ رہی ہو۔ یہ دُعا مانگو۔ کہ ہندوستان کی کوئی عورت عذرا کی قسمت لے کر پیدا نہ ہو۔ خیر چھوڑو ان فضول باتوں کو۔

ظفر۔ عذرا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ میری محبت ہمیشہ جوان رہے گی۔ تم مجھے پہچانتی ہو۔ اور میں تمہیں۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔

عذرا۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) بہن زکیہ۔ ذرا میرے نزدیک تو آؤ۔ کتنی معصوم ہو (زکیہ نزدیک آتی ہے) لیکن بہن دیکھنا۔ یہ اس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ میری اور ان کی یونہی سرسری ملاقات ہوئی تھی۔

ظفر۔ ۔ ۔ ۔ عذرا ۔ ۔ ۔

عذرا۔ میری اور انکی سرسری ملاقات ہوئی تھی (اس کے گلے میں

ہار ڈال کر) زکیہ یہ میری آخری نشانی ہے۔۔۔ ان کے لئے نہیں بلکہ تمہارے لئے۔ ان میں صرف ایک خامی ہے کہ وُہ جس سے محبت کرتے ہیں۔ بہت زیادہ کرتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ ساتھ شاعرانہ بڑیں بھی ہانکتے ہیں۔ ظفر کی طبیعت کو سمجھنا بھی ذرا مشکل کام ہے۔ لیکن تم جیسی حسین اور معصوم لڑکی تو فوراً سمجھ جائے گی۔ انہیں کسی موقعہ پر دُکھ نہ پہنچانا۔ کیا کہوں بہن (ہنستے ہوئے) بڑے عجیب آدمی ہیں۔ تمہیں ایسا انسان کبھی نہیں مِل سکتا۔

ظفر۔ عذرا! میں اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ میرا سینہ چھلنی ہو چکا ہے۔ اس پر نمک نہ چھڑکو۔

عذرا۔ سُنا بہن! ظفر صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ بڑے عجیب آدمی ہیں۔ اِن سے ایک دفعہ جو شخص مِلے۔ پھر وہ انہیں بھُول نہیں سکتا۔

ظفر۔ (جیب سے خط نکال کر عذرا کے ہاتھ میں دیتا ہے) عذرا یہ میری آخری نشانی ہے۔

عذرا (خط کھولے بغیر اپنے سینے سے لگا لیتی ہے) زکیہ بہن! بڑے اچھے آدمی ہیں یہ (مسکرا کر) اِن سے کبھی سختی سے پیش نہ آنا۔ میری اور ان کی سرسری ملاقات ہوئی تھی۔

زکیہ۔ (روتے ہوئے) میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ لیکن انکو۔۔۔

عذرا - تمہارے چہرے سے معلوم ہو رہا ہے کہ تم بڑی زیرک ہو - ظفر - دیکھو - زکیہ کتنی حسین ہے - اس سے ہمیشہ محبّت کرنا -

ظفر - عذرا! میں تمہاری قربانی کو پہچانتا ہوں -

عذرا - زکیہ بہن! مجھے ان سے . . . میری اور ان کی سرسری ملاقات ہوئی تھی . . . مجھے یقین ہے کہ یہ تم سے محبّت کریں گے - تمہیں اپنا بنائیں گے - (روتے ہوئے) میرے رونے سے کچھ اور نہ سمجھ لینا - کاش - میں تمہاری مسرت دیکھ سکتی . . . میری اور ان کی سرسری ملاقات ہوتی تھی - آہ! ظفر . . . .

(اس کے بعد عذرا پر موت کی غشی طاری ہو جاتی ہے زکیہ اور ظفر دوڑ کر سنبھالتے ہیں - ڈاکٹر اندر لیجانے کا اشارہ کرتا ہے - زکیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہے - اس نے اپنا سر ظفر کے کاندھے پر رکھ دیا ہے - مسعود اور ظفر سر جھکاتے خاموش کھڑے ہیں - آہستہ آہستہ دونوں نرسیں اور ڈاکٹر عذرا کو باہر لے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے)

مزدور کی ذہنیت

(ایک ڈراما)

کردار :-

سیٹھ بنواری لال ——— بمبئی کا ایک سیٹھ
پرکاش ——— اس کا نوجوان بیٹا
کالی چرن ——— مینیجر
روپ نرائن ——— ایک قومی لیڈر

اِن کے علاوہ مزدوروں کا ہجوم - پولیس سب انسپکٹر - سپاہی - ڈاکٹر وغیرہ -

منظر اوّل

(سیٹھ بنواری لال اپنے عالی شان مکان کے ایک کمرے میں لیٹا ہوا ہے ۔ اس کی عمر ستّر برس کے قریب ہوگی چند روز سے بیمار ہے ۔ چہرے سے نقاہت کے آثار نمایاں ہیں - اس کے پلنگ کے ارد گرد کرسیوں پر پرکاش اور کالی چرن بیٹھے ہیں - ڈاکٹر قیاس القلب سیٹھ کے سینے پہ لگائے کھڑا ہے - سیٹھ کھانستا ہوا اچھلّا کر روکتا ہے - اور ڈاکٹر کو دھکیل کر ایک طرف کر دیتا ہے -

اسٹیج کے دائیں کونے پر ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے - جس پر رنگا رنگ کی دوائیں چُنی ہوئی ہیں - ڈاکٹر اس میز کے قریب چلا جاتا ہے - کمرے کی آرائش امیرانہ ٹھاٹھ

ظاہر کر رہی ہے۔ سیٹھ کھانستا ہوا سینے پر ہاتھ رکھ لیتا ہے اور بلند آواز سے کہتا ہے)

سیٹھ بنواری لال - بیٹا! تم ابھی ان مرداروں کو نہیں سمجھتے۔ یہ بہت ذلیل انسان ہوتے ہیں۔

پرکاش - ذلیل ہوں یا معزز - آخر انسان تو ہیں - پتا جی - میں...

سیٹھ - تم نوجوانوں کی عقل کو کیا ہو گیا ہے (سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانستا ہے) ان لوگوں سے نپٹنا میرا ہی کام تھا۔ میں کہوں یہ بہت ہی ذلیل انسان ہوتے ہیں۔ سر پر جوتا رہے۔ تو خوش۔ جو ہی شفقت کا ہاتھ رکھا۔ تو فوراً پھیل پڑے۔

پرکاش - پتا جی! اگر انہوں نے اس طرح ہڑتال جاری رکھی تو ہمیں کس قدر نقصان اٹھانا پڑیگا۔

سیٹھ - بیٹا گھبرا گئے۔ میں نے ایسی، کیا کہوں، گیدڑ بھبکیاں ہزاروں بار دیکھی ہیں۔ دیکھتے رہنا - جب انہیں کھانے کو کچھ نہ ملا - تو یہ ذلیل کتے دم ہلاتے ہوئے میرے پاؤں چاٹیں گے۔

(سیٹھ فاتحانہ انداز سے کالی چرن کی طرف دیکھتا ہے)

کالی چرن - (مصنوعی دانت دکھاتے ہوئے) حضور، سچ کہہ رہے ہیں آخر یہ بدمعاش روٹی کہاں سے کھائیں گے۔

سیٹھ - بیٹا! تمہیں غم کاہے کا - اپنی دولت چھوڑ جاؤں گا کہ تمہاری

سات پشتیں بھی کھاتی رہیں تو اُن سے ختم نہ ہو۔ ڈاکٹر! وہ دوا لانا۔ دِل گھبرا رہا ہے۔

(سیٹھ تھک کر تکیئے کا سہارا لیتا ہے)

پرکاش - پتاجی! یہاں دولت کا سوال نہیں۔ عزّت اور وقار اگر ہے تو سب کچھ ہے۔ دنیا یہی کہے گی کہ سرمایہ دار کے دِل میں خوف نہیں۔ ہمارا اِل بدنام ہو جائے گا اور سارے کاروبار کی تباہی یقینی ہے۔

سیٹھ - (جھلّا کر اُٹھتا ہے) دنیا؟ دُنیا والے؟ میں انہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ کیا کہوں میرا کوئی بگاڑ ہی کیا سکتا ہے؟ کیا کہوں جب میں بمبئی میں آیا تو بالکل غریب تھا۔ دُنیا مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اور میں دنیا کو۔ تمہاری ماتا کے زیور رکھ کر میں نے دلالی کا کام شروع کیا۔ کیا کہوں یہ پرماتما کی دین اور میری اپنی ہمّت تھی کہ میں پندرہ بیس سال میں اس رتبے کو پہنچ گیا۔ کہیں دنیا والوں کے اختیار میں ہوتا تو وہ مجھے یہاں تک پہنچنے دیتے؟ دُنیا! دُنیا والے۔ سب بکواس ہے۔ اپنے من کو فریب دینے کے لئے ایک نعرہ بنا لیا ہے۔ ڈاکٹر! ابھی دوا نہیں لائے۔ سو گئے ہو کیا؟

(سیٹھ پھر تکیے پر گر پڑتا ہے۔ ڈاکٹر ایک سُرخ رنگ کی دوا گلاس میں ڈال کر سامنے لاتا ہے۔ اس کی پیٹھ

کی طرف ہے)

پرکاش۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن ان کا مطالبہ ایسا نہیں جس سے آپ کے وقار کو صدمہ پہنچے۔

سیٹھ (ڈاکٹر کو دھکا دے کر ایک طرف کرتے ہوئے) پھر وہی بات۔ کیا کہوں۔ وہ ہیں کون مطالبے منظور کرنے والے؟ گویا وہ ان دھمکیوں سے مجھے مجبور کر لیں گے؟ ہوں۔ ان میں اور مجھ میں کوئی فرق نہ ہوا!

پرکاش۔ انسان ہونے کی حیثیت سے تو کوئی فرق نہیں۔

سیٹھ۔ (دوا پیتے ہوئے) ایک درخت پر ایک ہی قسم کے پھل لگتے ہیں۔ جب جھکڑ چلتا ہے تو کمزور پھل ٹوٹ کر الگ ہو جاتے ہیں اور مضبوط اپنی جگہ پر جمے رہتے ہیں۔ اس دنیا میں کمزور اور اس شخص کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں جس کی کھوپڑی میں بھیجا نہیں۔

پرکاش۔ آپ کے حالات۔

سیٹھ۔ حالات والات کچھ نہیں۔ مجھ میں ہمت تھی۔ دماغ تھا۔ اسی کے بل پر میں نے روپیہ کمایا اور دنیا کو جی بھر کے بیوقوف بنایا۔ اگر دنیا میں تھوڑی سی بھی سمجھ ہوتی تو اس طرح نہ لٹتی۔ میں دنیا کی آنکھوں میں دھول ڈال کر آگے بڑھتا گیا۔ آج جب کہ اتنا بڑھ گیا ہوں تو اسے ہوش آیا۔ اب کیا ہوتا ہے انہیں

معلوم ہونا چاہیئے کہ جس شخص میں اُن سے زیادہ ہوش ہوگا - وُہ دنیا میں ضرور بڑھے گا - اور یہ بیوقوف تم سے بڑا آدمی کہتے ہیں ؂

کالی چرن - حضور! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں -

پرکاش - میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اُن کے مطالبات بالکل معمولی ہیں - اگر ہم منظور کر لیں تو بات رفع دفع ہو سکتی ہے - وہ کہتے ہیں کہ کھانے کے لئے آدھ گھنٹہ کے بجائے ایک گھنٹہ کی چھٹی ہونی چاہیئے - بڑے بڑے تہواروں پر بھی چھٹی دی جائے اور اس روز کی اجرت نہ کٹے - یہ معقول مطالبے ہیں اور ہمارے لئے بالکل معمولی بات ہے

سیٹھ - کیا کہوں - تم نہیں جانتے - وہ وہی دن ہیں بھاگے ہوئے میرے پاس آئیں گے - کانگریس کے دو ایک شرارتی لیڈروں کے بل بوتے ناچ رہے ہیں - روٹی نہ ملی تو بلبلا کر مِل کی طرف دوڑیں گے -

پرکاش - پتا جی! صرف بدنامی کا خیال ہے اور . . .

سیٹھ - کیا کہوں - ڈاکٹر! تھوڑی سی دوا اور دے دو - دِل بیٹھا جا رہا ہے - تم بدنامی کی فکر نہ کرو - اِس دنیا میں صرف بیوقوف لوگ بدنام ہوا کریں - میں بیوقوف نہیں ہوں - اگر آج دنیا مجھے حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے تو میں تمہیں یہ

بتا دوں۔ کہ میری ارتھی بمبئی کی سب سے بڑی ارتھی ہوگی ارتھی کے ساتھ اتنے آدمی ہوں گے کہ دنیا حیران رہ جائے گی۔

پرکاش۔ وہ کیسے؟

کالی چرن۔ حضور!

سیٹھ۔ کیا کہوں؟ میں نے سب کام ٹھیک کر لیا ہے۔

(ایک سپاہی اندر آتا ہے اور ایک لفافہ سیٹھ جی کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ سیٹھ پڑھ کر قہقہہ لگاتا ہے)

سیٹھ۔ بیٹا سنتے ہو۔ پولیس کی طرف سے پیغام آیا ہے کہ مزدوروں کا ہجوم بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ وہ ہمارے بنگلے پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی شخص روپ نرائن کانگریسی انہیں خوب بھڑکا رہا ہے۔ پاگل کہیں کے! (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور جوش میں کہتا ہے) میں بھی دیکھوں ان کا جوش۔ جاؤ۔ پولیس سے کہہ دو۔ کسی مزدور پر ترس نہ کھائیں۔ پاگل کہیں کے۔ سمجھتے ہونگے ایک لیڈر مل گیا ہمیں۔ منظم ہو گئی ہماری جماعت، کیا میں نہیں جانتا۔ اِس قسم کے لیڈروں کو اور ایسی تنظیموں کو۔

(نقاہت سے بہت دیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ بیہوش ہو کر نیچے گرتا ہے اور پرکاش اِسے سنبھالتا ہے)

دوسرا منظر

(شہر سے باہر ایک چھوٹے سے باغ میں مزدوروں کا ایک ہجوم جمع ہے۔ روپ نرائن اسٹیج پر کھڑا تقریر کر رہا ہے۔ مزدوروں کا مجمع لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا ہے۔ بعض مزدور اپنی حاضری ہی اپنا فرض تصوّر کرتے ہیں اور اِدھر اُدھر بیٹھے بیڑیاں پی رہے ہیں۔ لالہ روپ نرائن بڑے جوش و خروش سے تقریر کر رہے ہیں اور بار بار میز پر مکّا مارتے ہیں۔ پھر آسمان کی طرف پہلی انگلی سیدھی کر دیتے ہیں۔ دُور کھڑے رہنے سے سوائے خوانچے والوں کی آوازوں کے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اشتہار میں یہ درج تھا کہ لاؤڈ سپیکر کا انتظام ہو گا۔ لیکن معلوم نہیں۔ کیوں نہیں ہو سکا۔

رُوپ نرائن - (تقریر کرتے ہوئے) سرمایہ داری کے خلاف اعلانِ جنگ کر دو۔ ۔ ۔ انسانیت کی پیشانی پر بدترین داغ سرمایہ داری ہے۔ کچل ڈالو اسے تاکہ تم کچلے جانے سے بچ جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ کروڑوں انسانوں کو پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا اور سرمایہ دار ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہیں۔ زندہ رہنا چاہتے ہو؟

آوازیں - ہاں، ہاں!

روپ نرائن - تو زندہ رہنے کے طور سیکھو۔ اگر تم اپنی زندگی کا ثبوت نہیں دے سکتے - تو اِس سے مر جانا بہتر ہے تمہارے سیٹھ کے دماغ میں فرعونیت سمائی ہوئی ہے۔ اِسے اپنی ہمّت سے نکال کر باہر پھینکو . . . کیا تم انسان نہیں ؟

آوازیں - بے شک ! بے شک ! !

روپ نرائن - کیا وہ سیٹھ تمہاری طرح انسان نہیں ہے ؟

آوازیں - بے شک ! بے شک ! !

روپ نرائن - تو کیا وجہ ہے کہ اُس کے گھر میں تو دولت ٹھیکروں کی طرح ارزاں ہے اور تمہارے بچے بھوک سے بلبلا رہے ہیں . . . اے بیوقوفو! کبھی تم نے سوچا بھی ؟ کیا اِسی طرح پس پس کر جان دے دو گے ؟

آوازیں - ہرگز نہیں۔

روپ نرائن - کِس قدر معمولی تھا تمہارا - لیکن سیٹھ اُسے بھی تسلیم نہیں کرنا چاہتا - اب کیا ارادے ہیں ؟ دو گے اپنی زندگی کا ثبوت ؟

آوازیں - ضرور دیں گے۔

روپ نرائن - سرمایہ داری کو تباہ کر دو -

آوازیں - ہم تیار ہیں -

روپ نرائن - اس وقت تک چین سے نہ بیٹھو - جب تک کہ سیٹھ

روتا ہوا تمہارے پاؤں نہ پڑے۔

آوازیں - ایسا ہی ہوگا۔

روپ نرائن - کارخانے پر پکٹنگ لگا دو۔ اور کسی مزدور کو اندر نہ جانے دو۔

(اس وقت ایک سب انسپکٹر پولیس اسٹیج پر چڑھتا ہے اور ایک سرکاری پروانہ لالہ روپ نرائن کو دکھاتا ہے وہ پروانے کو دیکھ کر زہر آلود مسکراہٹ سے واپس کر دیتا ہے)

روپ نرائن - بھائیو! حکومت بھی سرمایہ داروں کا ساتھ دیتی ہے مجھے ابھی یہ حکم دیا گیا ہے کہ یہ مجمع فوراً منتشر ہو جائے۔ ورنہ لاٹھی چارج کیا جائیگا۔ کیا کہتے ہو تم؟ جہاں تم نے اتنے زخم کھائے۔ لاٹھی کا زخم اور سہی۔

آوازیں - بیشک! بیشک! ہم اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے۔

ایک آواز - میں بیڑی پیتے پیتے بھی لاٹھی کھاؤں گا۔

(سب انسپکٹر پولیس سپاہیوں کو حکم دیتا ہے کہ مجمع فوراً منتشر کر دیا جائے۔ قسم قسم کے نعروں سے میدان گونج اُٹھتا ہے۔ ابھی سپاہی مجمع میں گھسے ہی تھے کہ دُور سے سیٹھ کا مینجر کالی چرن آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور دُور سے ہی اشارے کر رہا ہے۔ ایک وقفہ کے لئے

خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ کالی چرن سر جھکائے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے اور اسٹیج پہ چڑھ جاتا ہے اور پولیس کو ایک طرف ہو جانے کا اشارہ کرتا ہے)

کالی چرن - میں آپ بھائیوں کو یہ خبر سنانے آیا تھا کہ سیٹھ صاحب سرگباش ہو گئے ہیں۔

(مجمع میں ایک شور مچ جاتا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں!
"غریبوں کی آہ!" "اچھا ہوا بے ایمان بوڑھا چلا گیا"
"اب دولت اپنے ساتھ لے جائے"۔ "آدمی بڑے حوصلہ والا تھا" وغیرہ)

روپ نرائن - سیٹھ صاحب سرگباش ہو گئے۔ ان کی موت کے بعد ہم اُن کے خلاف کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن اب ان کا بیٹا برسرِ اقتدار ہو گا۔ میں سنتا ہوں کہ وہ مزدوروں کا خیر خواہ ہے۔ لیکن سانپ کا بچہ سانپ ہی کہلائیگا۔ جھوٹے وعدوں میں نہ آنا۔ ہمیں اپنی جنگ جاری رکھنی چاہیئے۔ یہ جنگ سرمایہ داری کے خلاف ہے۔ کسی فرد کے خلاف نہیں۔

(پولیس دوبارہ حرکت کرنا چاہتی ہے۔ لیکن منیجر پھر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی جیب سے کاغذ نکالتا ہے)

کالی چرن - (بلند آواز سے) بھائیو! جو آپ کی طبیعت میں آئے کیجیے۔ یہ سیٹھ صاحب کا آخری پیغام ہے۔ مرتے وقت انہوں نے

کہا تھا کہ یہ مزدوروں کے مجمع کے سامنے پڑھا جائے (پڑھتا ہے)

"میں اس دُنیا سے جا رہا ہوں۔ لیکن میرے دل میں مزدوروں کی محبت میرے ساتھ جائے گی۔ جو شخص میری ارتھی میں شامل ہوگا۔ اُسے ایک روپیہ ملے گا۔ یہ روپیہ صرف وقت ضائع کرنے کا معاوضہ ہے۔ مجھے مزدوروں سے محبت تھی۔ اپنے بیٹے سے بھی زیادہ محبت تھی۔ افسوس کہ وہ مجھے نہ سمجھ سکے۔ باپ اپنے بیٹوں پر ناراض ہوا ہی کرتے ہیں۔ میں نے ایک علیحدہ وصیت لکھوا دی ہے۔ جو صرف شمشان ہی میں کھولی جائے گی۔ اس کی رو سے میں نے مزدوروں کو اپنی ساری دولت کا وارث قرار دیا ہے۔ محبت بھرے دل سے میں رخصت ہوتا ہوں"

(مجمع میں ایک شور مچ جاتا ہے۔ مزدوروں کے چہرے تمتما اُٹھتے ہیں)

پہلا ۔ واہ رے میرے سیٹھ، جی چاہتا ہے۔ تم پر اپنے سارے بیٹے قربان کر دوں۔

دوسرا ۔ مرتے مرتے بھی ایک کام کر گیا۔

تیسرا ۔ ایسا نیک دل انسان دنیا میں بار بار پیدا نہیں ہو سکتا۔

چوتھا ۔ اب سنا، اپنی ساری جائداد ہم کو دے گیا۔

پانچواں ۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ سیٹھ کے دل میں بڑی مروت ہے۔

چھٹا ۔ ہم سے کتنی محبت کرتا تھا۔

ساتواں۔ کارخانے میں جب بھی آتا تو ہم سب سے ہنس ہنس کے باتیں کرتا۔
آٹھواں۔ اور ہمارے بال بچوں کی خبر پوچھتا۔
نواں۔ افسوس آخری دفعہ اس کے درشن نہ ہوئے۔
رُوپ نرائن۔ (گلا پھاڑ کر) یہ سب جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ میں تمہیں
ایک آواز۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ ہمارا سیٹھ بڑا دھرمی انسان تھا۔ تم ہمیں پھسلا رہے ہو۔

(اس کے بعد مجمع میں ایک شور برپا ہو جاتا ہے۔ اور رُوپ نرائن پر اینٹوں اور جوتوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ سارے مزدور بکھرنا شروع ہو جاتے ہیں اور ارتھی میں شریک ہونے کے لئے سیٹھ کے مکان کی طرف چل دیتے ہیں۔ میدان خالی ہو جاتا ہے۔ اور رُوپ نرائن مزدوروں پر دانت پیستا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

تیسرا منظر

شمشان میں ہزارہا مزدوروں کا اجتماع۔ کہتے ہیں کہ بمبئی نے اس سے پہلے اتنا عظیم الشان جنازہ نہیں دیکھا۔ ہر ایک مزدور سیٹھ کی تعریف میں رطب اللسان ہے سیٹھ

صاحب کی وصیت ۔ سیٹھ صاحب کی وصیت کے نعروں سے شمشان بھومی گونج اٹھتی ہے۔ سیٹھ صاحب کی لاش کو نذرِ آتش کرنے سے پہلے منیجر کالی چرن ایک چھوٹی سی میز پر کھڑا ہو جاتا ہے اور بند لفافے کو کھولتا ہے)

ایک مزدور ۔ سنو سنو ۔ سیٹھ صاحب کی وصیت ۔

کالی چرن ۔ یہ سیٹھ صاحب کی وصیت ہے ۔ سب لوگ غور سے سنیں۔ (پڑھتا ہے) اے مزدورو ۔ سب سے پہلے میں تمہیں اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے تم سے ذرا بھر بھی محبت نہیں ۔ میں تمہیں ہمیشہ ذلیل سمجھتا رہا ہوں اور مرنے کے بعد بھی ذلیل سمجھتا رہوں گا ۔"

ایک آواز ۔ سیٹھ صاحب کی وصیت پڑھو ۔ یہ تو کچھ اور پڑھ رہے ہو

کالی چرن ۔ . . . وہی ہے ۔ میں تمہیں یہ بات جتا دینا چاہتا ہوں کہ سرمایہ دار مرنے کے بعد بھی تم پر غالب رہ سکتا ہے اس کی روح بھی تمہیں پاش پاش کر دینے کے لئے کافی ہے ۔ اے ذلیل کتو!

ایک آواز ۔ ہم نہیں سننا چاہتے ۔ ہم سے دھوکا ہوا ۔

کالی چرن ۔ "اے ذلیل کتو! میں تم پر اتنا ظلم نہیں کرنا چاہتا ۔ تم میں سے ہر ایک کو ایک ایک روپیہ مل جائیگا ۔ لیکن تمہارے دماغ میں تو جائداد بھی چکر کاٹ رہی ہوگی ۔ آگئے میرے بھرّے

میں؟ میں تمہیں اُلّو بنانا چاہتا تھا۔ اور بنا لیا۔ تمہیں یہ خیال نہ آیا۔ کہ تم جیسے پاجیوں کو میں اپنا وارث قرار دے سکتا ہوں؟ میری جائداد کا مالک میرا بیٹا ہوگا۔ تم کون؟ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ تم نعرہ ہائے تحسین کے ساتھ میرے مرنے کے بعد مجھے شمشان بھومی تک پہنچاؤ۔ تاکہ دنیا دیکھ لے کہ جس سرمایہ دار کے خلاف تم مظاہرے کر رہے تھے۔ مرنے کے بعد وہ تمہارے ہی کندھوں پر شمشان بھومی کی طرف جا رہا ہو۔۔۔ میں جانتا ہوں تمہاری ذہنیت۔

ایک آواز۔ ہم یہاں نہیں ٹھہرنا چاہتے۔

دوسری۔ اس بوڑھے پاجی نے ہمیں مر کر بھی دھوکا دیا۔

تیسری۔۔۔۔ کہاں جا رہے ہو؟

چوتھی۔ ارے بھئی۔ وہ ایک ایک روپیہ کیوں چھوڑ رہے ہو۔

کالی چرن۔ (پڑھتا ہے) میری لاش جل جانے کے بعد میرا مینجر تمہیں ایک ایک روپیہ دے دیگا۔ اور کیا چاہتے ہو ہامرزاد خور کتو۔ تم تو اسی کو غنیمت سمجھو گے۔ میری رُوح تم پر قہقہے لگا رہی ہے۔ ایک لاش تمہارا مقابلہ کر رہی ہے مجھے اُمید ہے کہ تم آئندہ کسی سرمایہ دار کے خلاف اِس قسم کے احمقانہ مظاہرے نہیں کروگے۔

ایک آواز۔ روپے جلدی تقسیم کرو۔

کالی چرن ۔ سیٹھ صاحب کی مکتی کے نعرے لگاؤ ۔

(نعروں سے فضا گونج اٹھتی ہے ۔ لاش کو نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے ۔ روپیہ مزدوروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ۔ سب مزدور ایک دوسرے پر ٹوٹ رہے ہیں ۔ بہت سے مزدور روپے لیکر باہر نکل رہے ہیں)

پردہ

مرزا

اور

اُس کے دوست

بات چیت کا ایک انوکھا

سلسلہ

کردار :-

نعیم - رؤف - مرزا مشرف اور بیرا -

منظر

(کیفے کا ایک کونہ)

نعیم - بیرا -

بیرا - (دُور سے) حضور -

نعیم - دیکھو تین پلیٹ آئس کریم لاؤ -

بیرا - بہت اچھا حضور -

رؤف - نعیم! یہ تین پلیٹیں کس لئے منگوائی ہیں ؟

نعیم - بات دراصل یہ ہے کہ مرزا مشرف نے ہمیں اس طرف آتے دیکھ لیا تھا - بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں دیکھ لیں اور ہمارا پیچھا نہ کریں ؟

رؤف - سچ کہتے ہو - یہ تمہارا مرزا بڑا دلچسپ آدمی ہے -

نعیم - دلچسپ کے علاوہ بھی اگر تم کچھ کہہ دیتے تو میں مان لیتا - اُسے ہر وقت لوگوں کی اصلاح کی دھن رہتی ہے - وہ بیسویں صدی کا ریفارمر ہے -

رؤف - میرا تو خیال ہے کہ اس کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہے -

نعیم - ہاں، بعض اوقات تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن عوام کی اصلاح کا اسے خبط ہو چکا ہے - اور سچی بات تو یہ ہے - کہ وہ اپنے اس خبط میں بیحد نیک نیت اور پُر خلوص انسان ہے -

رؤف - لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ ریفارمر بننا بھی ایک قسم کا مرض ہے - خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ ہی پھنسانا کہاں کی عقلمندی ہے ؟

نعیم - دیکھو رؤف ! اس معاملے میں میرا اور تمہارا ہمیشہ اختلاف رہا ہے - انسانی ذہنیتیں کبھی بھی صاف نہیں ہوئیں - انسان اپنے دماغ کی تکمیل کے لئے ہمیشہ دوسروں کا مرہونِ منّت رہا ہے - اکثر اوقات جب سر پر کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو انسان اکیلا اس الجھن سے باہر نہیں نکل سکتا - اسے ضرور کسی نہ کسی بیرونی امداد کا محتاج ہونا پڑتا ہے - اولادِ آدم کو تو ہمیشہ اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی رہے گی -

رؤف - نعیم صاحب ! آپ نے لیڈرانہ انداز میں جو کچھ کہا - وہ درست ہو گا - لیکن میں تو اتنا سمجھتا ہوں کہ انسانوں نے اصلاح کے خلاف ہمیشہ بغاوت کی ہے اور کرتے رہیں گے -

نعیم - یہ تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے - جب انہیں پرانی بات چھوڑنے اور نئی بات اختیار کرنے کے لئے کہا جائے تو انہیں

صدمہ پہنچتا ہے۔ لیجئے وہ مرزا صاحب بھی آ گئے۔

رؤف - تو میرا خیال ہے کہ کہیں سے اسپرین کی ایک گولی بھی منگوا لی جائے۔

(بیرا تین پلیٹیں آئس کریم رکھتا ہے۔ پلیٹوں کی آواز)

نعیم - آہا - آئیے مرزا صاحب - آپ آ گئے؟

(مرزا صاحب اندر آتے ہیں)

رؤف - بس آپ ہی کا ذکر خیر ہو رہا تھا - ایک انگریزی میں ضرب المثل ہے - لیکن وہ کہہ نہیں سکتا -

نعیم - (ہنس کر) واقعی ہم آپ کا ذکر کر رہے تھے

مرزا - ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے - سمجھ گئے نا!

رؤف - یہ دیکھئے نا - خیال بلکہ یقین تھا کہ آپ نے ہمیں کیفے میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہے - اس لئے ہم نے آئس کریم کی تین پلیٹیں منگوالی تھیں -

مرزا - بندہ نواز! یہ نہ سمجھئے گا کہ میں کھانے پینے کے لئے آپکے پیچھے آ گیا ہوں - سمجھ گئے نا! ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ذہن میں چکر لگا رہا تھا - جی میں آیا کہ آپ لوگوں کا مشورہ نہایت ضروری ہو گا - اس لئے ادھر آ گیا - سمجھ گئے نا!

رؤف - اس بات کی تو ہمیں پہلے ہی اُمید تھی -

نعیم - مرزا صاحب - یہ آئس کریم تو کھائیے -

دکھانا شروع کرتے ہیں)

مرزا - یار! کیوں تکلّف کیا کرتے ہو۔ خیر (منہ میں لقمہ) مجھے معلوم ہوا ہے کہ کھائے بغیر آپ مجھے یہاں سے ہلنے نہ دیں گے۔ سمجھ گئے نا!

نعیم - ہاں تو وہ کیا پیچیدہ مسئلہ تھا - جو آپ کو پریشان کئے ہوئے ہے

مرزا - بھائی کوئی پریشانی سی پریشانی ہے - میرا خیال ہے کہ دُنیا کا کوئی مجسٹریٹ بھی اِس مسئلے کا حل نہیں سوچ سکتا - سمجھ گئے نا

نعیم - دراصل قدرت نے غلطی کی - جو آپ کو مجسٹریٹ نہ بنایا - آپ ایسے آدمی مجسٹریٹ ہوں تو دنیا کو نجات مِل جائے۔

رؤف - اور ہمیں بھی۔

مرزا - رؤف صاحب! آپ غالباً میری باتوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ خیر دنیا کا تجربہ آپ کو سب کچھ سکھا دیگا۔ سمجھ گئے نا۔

نعیم - مرزا صاحب! رؤف صاحب تو آپ کی باتوں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں - ابھی ابھی کہہ رہے تھے کہ مرزا صاحب کے بغیر محفل بالکل سلونی معلوم ہوتی ہے۔

مرزا - میں آپ کا بیحد ممنون ہوں۔ سمجھ گئے نا - واقعہ دراصل یہ ہے سمجھ گئے نا . . کہ ہمارے دُور کے رشتے میں ایک خاتون ہیں - سمجھ گئے نا۔

رؤف - ہم تو خاک بھی نہیں سمجھے - صحیح صحیح بتائیے کہ آپ کا اور ان محترمہ کا رشتہ کیا ہے ؟

مرزا - یہ ضروری نہیں - سمجھ گئے نا ! ان کا صحیح پتہ بتانے سے ان کی توہین ہوگی - سمجھ گئے نا - آپ واقعہ سنئے - آٹھ سال ہوئے - اس خاتون نے ایک شخص سے شادی کی

رؤف - وہ شخص بھی آپ کا رشتے دار ہے ؟

نعیم - رؤف ! یونہی بات کاٹنے کا کیا فائدہ - نہایت دلآویز واقعہ معلوم ہوتا ہے - تم سنتے جاؤ -

مرزا - نہیں جناب ! وہ شخص میرا رشتہ دار نہیں تھا - سمجھ گئے نا

رؤف - جی ہاں ! بالکل سمجھ گیا -

مرزا - شادی سے پہلے تو کسی نے دیکھ بھال نہ کی - سمجھ گئے نا - خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اس شخص میں پانچوں شرعی عیب موجود تھے -

رؤف - اوہو ! مرزا صاحب ! آپ اس وقت کہاں تھے ؟

مرزا - اجی ! ہمیں تو اس وقت کسی نے پوچھا تک نہیں سمجھ گئے نا -

رؤف - گویا آپ کے رشتے دار آپ کو پوچھنے کے قابل نہیں سمجھتے - سچ ہے گھر کی مرغی دال برابر -

مرزا - (مصنوعی ہنسی) ہاں ! ایسا ہی سمجھئے - سمجھ گئے نا - ہاں تو وہ شراب اس قدر پیتا تھا کہ توبہ ہی بھلی - بڑی نیک لڑکی تھی

کہ سب کچھ برداشت کرتی رہی اور زبان سے اُف تک نہ کی۔ سمجھ گئے نا۔ کئی دفعہ وہ میکے بھی گئی۔ لیکن ہر دفعہ اس کا خاوند اُسے واپس لے آتا تھا۔ اس شرط پہ کہ وہ آئندہ شراب نہیں پئے گا۔ سمجھ گئے نا۔ لیکن وہ کبھی بھی اپنے وعدہ پہ قائم نہ رہا۔ آخر حالات نازک تر ہوتے گئے۔ تین بچے بھی پیدا ہو چکے تھے۔ وہ بیچاری تو عجیب کش مکش میں تھی۔ اسکا خاوند ہر وقت اسے اور اس کے بچوں کو نشہ کی حالت میں پیٹتا۔ اور شراب کی بدولت اُسے دفتر والوں نے بھی چھٹی دیدی۔ وہ کب تک برداشت کرتی سمجھ گئے نا۔ آخر ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اسے چھوڑ دے۔ چنانچہ وہ اپنے بچوں کو لے کر میکے چلی گئی۔ اور اپنے خاوند سے صاف کہہ دیا کہ وہ طلاق لینا چاہتی ہے۔ سمجھ گئے نا! لیکن ایک سال کے عرصہ کے بعد اس کا خاوند پھر اس کے پاس گیا اور جاتے ہی اس کے قدموں پر گر پڑا۔ سمجھ گئے نا۔ اور رو رو کر اپنے کئے کی معافی مانگنے لگا۔ ایسا اُس نے پہلے کبھی نہ کیا تھا سمجھ گئے نا!

رؤف ۔ بڑا چالباز انسان معلوم ہوتا ہے۔

نعیم ۔ پھر؟

مرزا ۔ وہ خاتون بھی کہتی ہے کہ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے واقعی توبہ کر لی ہے۔ لیکن مجھے تو اعتبار نہیں ہے سمجھ گئے نا۔

چونکہ اس خاتون نے اپنے خاوند کو قطعی طور پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لئے . . . سمجھ گئے نا . . . باتوں ہی باتوں میں اس نے ایک اور شخص سے تعلقات بڑھائے۔ وہ شخص نہایت نیک۔ رحم دل اور با اصول انسان ہے اور مکمل خاوند بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس خاتون نے جب اس شخص کو اچھی طرح پرکھ لیا تو پھر اس نے اس سے شادی کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔ لیکن ایک سال کے بعد اس کا خاوند گڑگڑاتا اس کے قدموں پر گر پڑا۔ سمجھ گئے نا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ اپنے خاوند کو چھوڑے یا پھر اس کے ساتھ واپس چلی جائے۔ سمجھ گئے نا۔

نعیم ۔ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ یہ پہیلی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس خاتون کے خاوند نے حقیقت میں توبہ کر لی ہے۔ لیکن اُدھر وہ دوسرے آدمی سے بھی وعدہ کر چکی ہے۔

رؤف ۔ کیا باتیں کر رہے ہو یار! کبھی کسی نے شراب کی توبہ بھی پوری کی ہے۔ وہ شخص ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ ارے بھائی شرابی کا کیا اعتبار! اب بھی وقت ہے کہ وہ خاتون اس ناہنجار سے اپنا دامن چھڑا لے۔

نعیم لیکن . . . اگر اس نے سچی توبہ کر لی ہو تو پھر . . ؟

رؤف ۔ بالکل ناممکن، شراب وہ ضرور پیئے گا۔

مرزا - میرا خیال ہے سمجھ گئے نا - اِس ٹیڑھے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو ضرور نکالنا چاہیئے سمجھ گئے نا - آخر اس وقت ہزاروں آدمی ہماری پرائیویٹ باتوں کو پڑھ رہے ہیں سمجھ گئے نا - انھی ہم نے اپنا ہمراز بنایا تو . . . کس لئے ؟ کیوں نہ ان سے بھی مشورہ لیا جائے - جتنے سر زیادہ ہوں گے - اتنا ہی فیصلہ اچھا ہوگا -

نعیم - بالکل ٹھیک ہے - یہ تجویز تو نہایت اچھی ہے -

(قارئین سے - مرزا صاحب اور ان کے دوستوں نے آپ کے سامنے ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ پیش کیا ہے مرزا صاحب کی خواہش کے مطابق ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ ایک ہفتہ تک اپنے قیمتی مشوروں سے بذریعہ خطوط مصنف کو آگاہ کریں - قابلِ قدر خطوط شائع کئے جائیں گے اور انھی خطوط کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرزا صاحب اور اس کے دوست اپنا آخری فیصلہ سُنائیں گے - ہمارا خیال ہے کہ اس وقت اس نیک خاتون کی قسمت آپ کے یا مرزا صاحب کے ہاتھوں میں ہے - خطوط مختصر اور مدلّل ہوں)

ایکٹرس

(ایک ڈرامہ)

کردار :-

شمیم ــــــــــــ ایک مشہور ایکٹریس
نعیم ــــــــــــ اس کا خاوند
زہرہ ــــــــــــ شمیم کی بہن
راجہ کنچن پور ــــــــــــــــــ
ڈاکٹر مشتاق احمد ـــــ نعیم کا ایک دوست
(ان کے علاوہ بہت سے اور خدمتگار)

منظر

(شمیم کے مکان کا ایک کمرہ - کمرے میں نہایت اہتمام سے روشنی ہو رہی ہے گویا کسی مہمان کا انتظار ہے - جب پردہ اُٹھتا ہے تو خدمتگار شمیم کی بہن زہرہ کو اندر لاتا ہے - زہرہ سفری لباس میں ہے اور چھوٹا سا بیگ اس کے ہاتھ میں ہے - وہ بہت گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی ہے)

زہرہ - بیگم کدھر ہیں؟ مجھے ابھی ان سے ملنا ہے -
خدمتگار - وہ تو اس وقت لباس پہن رہی ہیں -
زہرہ - کیوں؟ کہیں باہر جا رہی ہیں -
خدمتگار - حضور! آج یہاں ایک زبردست پارٹی ہے -

زہرہ - پارٹی ہے؟ ان کے شوہر کہاں ہیں؟

خدمتگار - ان کے شوہر؟ تو آپ نے ابھی تک خبر نہیں سُنی؟

زہرہ - تو کیا یہ بات سچ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جُدا ہو چکے ہیں۔

خدمتگار - ہاں حضور! یہ بات سولہ آنے درست ہے۔

زہرہ - اُف! کس قدر روح فرسا خبر ہے - وہ دونوں ایکدوسرے سے کس قدر محبت کرتے تھے اور ان کی شادی کو بھی تو ایک سال نہیں ہوا۔

خدمتگار - ہاں حضور معلوم تو ایسا ہی ہوتا تھا۔

زہرہ - معلوم؟ تمہارے آقا نے تو اپنی ساری زندگی صرف اکیلی شمیم کے لئے وقف کر دی تھی۔ اُس نے زمانہ بھر سے مخالفت کی۔ اپنی ناموس اور اعلیٰ خاندان کی پروا نہ کی محض اس لئے کہ وہ شمیم سے شادی کر سکے - ایک سال کے بعد یہ حشر ہوا طلاق کو کتنے دِن ہو چکے ہیں۔

خدمتگار - حضور! آج ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔

زہرہ - اچھا! تم بیگم کو میرے آنے کی اطلاع تو دو - ہاں! سنو - ایک ہفتہ طلاق کو ہوا ہے - اور آج شاندار پارٹی کا انتظام ہو رہا ہے - بھلا اس میں کن لوگوں کو دعوت دی گئی ہے؟

خدمتگار - کچھ کہہ تو نہیں سکتا - لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان لوگوں

کو دعوت دی گئی ہے۔ جنہیں میرے آقا ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔
اور انہیں کبھی بھی اس دہلیز پر قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔
ان مہمانوں میں راجہ کنچن پور بھی شامل ہیں۔

زہرہ ۔ (خوف زدہ ہو کر) راجہ کنچن پور بھی شامل ہیں؟ اُف!

خدمتگار ۔ میں بیگم کو اطلاع دینے چلا ہوں۔

(باہر نکل جاتا ہے)

زہرہ ۔ راجہ کنچن پور جیسا پاجی انسان جو شمیم کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے اور بمبئی میں تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ راجہ شمیم سے محبّت کرتا ہے۔ وہ بھیڑیا ہے۔ اُس نے پچھلے ایک سال میں شمیم اور اور اس کے خاوند کے نام پر دھبّہ لگانے کی حتی الامکان کوشش کی اور آج اس بھیڑیئے کو شمیم نے خود دعوت دی ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے:

(زہرہ اپنی بڑی بہن شمیم کی آواز سنتی ہے جو دور سے آرہی ہے)

شمیم ۔ دیکھو! آج یہاں شراب کے کپّے لنڈھائے جائیں گے۔ گانے والیوں کا بھی انتظام ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ میرے سب سے بڑے مہمان راجہ کنچن پور جب یہاں تشریف لائیں تو ہمارے کمرے میں کوئی اور شخص داخل نہ ہونے پائے۔

(وہ جب داخل ہوتی ہے تو اپنی بہن زہرہ کو دیکھ کر

حیران سی رہ جاتی ہے!

شمیم - زہرہ! تم کہاں سے آگئیں؟ ایک دیہاتی معصوم چھوکری اِس گناہ کی دُنیا میں کیونکر پہنچ گئی؟ بمبئی کی فضا تم ایسی چھوکریوں کے لیے تو بہت مضر ہے، خیریت تو ہے؟

زہرہ - شمیم - میں نے سُنا تھا کہ تم پر ایک مصیبت ٹوٹ پڑی ہے اور تم رنج و غم میں مبتلا ہو - لیکن تمہیں دیکھ کے مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم رنج و غم میں مبتلا نہیں ہو -

شمیم - میں رنج و غم میں مبتلا ہونا نہیں چاہتی - مجھ پر مصیبت کا ایک پہاڑ ضرور ٹوٹا ہے - لیکن میں ایسا تصوّر کر رہی ہوں - گویا کچھ بھی نہیں ہوا - اب میں نے یہ ٹھان لیا ہے - کہ مصیبتوں کے متعلق کبھی سوچنا نہیں چاہیئے - غالباً تم میرے اِس فلسفے کو پسند کرو گی! زہرہ! تم نے سُن تو لیا ہوگا؟ ہے تو قابلِ افسوس بات - لیکن اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا -

زہرہ - لیکن بات کیا ہوئی تھی؟

شمیم - بات تو کچھ بھی نہیں - یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بڑی باتیں بن جایا کرتی ہیں اور بات یہ تھی کہ ہماری شادی کو ایک سال ہوگیا تھا اور ایک ایکٹرس کے لیئے یہ مدّت بہت طویل ہے -

زہرہ - ایک سال زیادہ مدّت ہے؟ تم تو اس سے محبت کرتی تھیں!

شمیم۔ ہاں! کبھی تھی!
زہرہ۔ کبھی؟
شمیم۔ ہاں! محبت کرتے کرتے اب طبیعت سیر ہو چکی ہے۔ سال کے ۱۲ مہینے اور ۱۲ مہینے کے ۳۶۵ دِن۔ اُف! ہر روز صرف اسے ہی دیکھتے دیکھتے جی اُکتا گیا تھا۔ اور اب تو ایکٹرسوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ لباس کی طرح ہر موسم میں شوہر بدل لینا چاہیئے۔

زہرہ۔ آپا شمیم۔ میں اس دفعہ تمہیں مِل کر بہت مایوس ہوئی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ کہ یہ الفاظ تم کہہ رہی ہو۔ یہ الفاظ تمہارے ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ تم سب بناوٹی باتیں کر رہی ہو۔ تم نے ایکٹرس کی ناپاک زندگی کو ختم کر کے ایک معزز خاندان کے فرد سے نکاح کیا۔ سوسائٹی میں تمہاری قدر ہونے لگی۔ ہر جگہ تمہیں احترام کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ آج تم پھر جذبات کی رو میں بہہ کر اپنا سارا وقار تباہ و برباد کرنا چاہتی ہے۔ خدا کے لئے ایک بڑے خطرے سے پہلے چھوٹے خطرے کو برداشت کر لو۔

شمیم (طنزیہ لہجہ میں) میری عزت، میرا وقار . . . اونہہ! شادی کر لینے کے بعد میں ایکٹریس ہوں۔ مذہب نے مجھے

ہمیشہ کے لئے مردود قرار دیدیا ہے۔ سوسائٹی میں یہ شریف گھرانے کی عورتیں مجھ پر انگلیاں اُٹھاتی ہیں۔ میں گزرتی ہوں تو شریف لوگ اپنا دامن بچاتے ہیں۔ کہ میری ساڑھی کا پلّو کہیں ان کے لباس سے نہ چھو جائے۔ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ میری جوانی ڈھل جانے کے بعد کوئی مجھے یاد نہیں کرے گا۔ اور میرے مرنے کے بعد کتے کی طرح مجھے کسی کھڈ میں پھینک دیا جائے گا۔ میں مشترکہ جائداد ہوں میری زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔ اِن حالات میں میں اپنی زندگی کو بالکل بے معنی سمجھتی ہوں۔

زہرہ لیکن آج میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ شخص جس نے تمہاری عزت پر حملہ کیا۔ تمہارے شوہر کی ناموس کو تباہ کرنا چاہا اور دن دہاڑے تمہیں اُٹھانے کا ارادہ کیا۔ تمہاری اس دعوت میں مدعو کیا گیا ہے اور تم اس کے استقبال کے لئے گھر کو چراغاں کر رہی ہو؟

شمیم۔ ہم حسین عورتوں کو اتنا سنگدل نہ ہونا چاہیئے۔ راجہ کنچن پور خواہ کتنے ہی بُرے آدمی سہی۔ لیکن وہ بیچارا میری محبت میں بُری طرح گرفتار ہے۔ اگر پانی کو کیتلی میں ڈالکر آگ پر رکھ دیا جائے۔ تو پانی ضرور اُبلے گا۔ یہ تو آگ کا قصور ہے۔ میں حسین ہوں۔ اِس لئے میری محبت میں

دیوانہ ہو چکا ہے۔ میں اتنی گئی گذری تو نہیں کہ اس کی محبت کی قدر نہ کروں . . . اور . . . نعیم اور راجہ صاحب کا مقابلہ ہی کیا ہے۔ وہ ایک ریاست کا مالک ہے اور نعیم ایک ادنیٰ درجہ کا آوارہ گرد انسان!

زہرہ۔ اُف۔ تم اپنے شوہر کے لئے یہ الفاظ استعمال کر رہی ہو؟ اس کا مطلب ہے کہ میرا یہاں آنا بے سود تھا۔ مجھے جانا چاہیئے۔

شمیم۔ ہاں! تمہیں چلے ہی جانا چاہیئے۔ کیونکہ اس شاندار دعوت کا منظر تمہاری آنکھیں نہ ہی دیکھیں تو اچھا ہے۔

زہرہ۔ (جانے کے لئے تیار ہوتی ہے) اچھا الوداع! میرا خیال تھا کہ میں اپنی بہن کو بربادی سے بچا سکوں گی لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تم لاعلاج ہو چکی ہو۔

(زہرہ باہر نکل جاتی ہے اور شمیم دروازے کو تالا لگا لیتی ہے اور پھر اِدھر اُدھر دیکھ کے اپنے شوہر کو پکارتی ہے)

شمیم۔ نعیم! نعیم۔ میرے پیارے شوہر۔

(نعیم دروازے سے داخل ہوتا ہے)

نعیم۔ میری پیاری شمیم! یہاں کوئی آ تو نہیں جائے گا۔

شمیم۔ آپ بے فکر رہیں میں نے تالا لگا دیا ہے اور اب ہمارا

کام بالکل تیار ہو چکا ہے۔ ہر ایک کو یقین ہو گیا ہے کہ آپ نے مجھے واقعی طلاق دیدی ہے۔ ہماری یہ سازش بیحد کامیاب ہو رہی ہے۔ سارے شہر میں ہمارا ہی ذکر ہو رہا ہے۔

نعیم - اور راجہ گنجن پور؟

شمیم - اوہ! وہ تو بالکل میرے فریب میں آگیا ہے۔ جیسا آپ نے مجھے ہدایت کی تھی۔ اسی طرح میں نے اس سے کہا کہ میں اس شادی شدہ زندگی سے بالکل تنگ آگئی ہوں بس وہ فوراً میرے بھرے میں آگیا۔ آج میں نے اس کے بہت سے دوستوں کو بھی دعوت دیدی ہے۔

نعیم - آہ! آخر کار آج انتقام کے لمحے آن پہنچے۔ میں اس گھڑی کا ایک مدت سے انتظار کر رہا تھا اور اس انتظار میں میری روح کو جو صدمے پہنچے ہیں۔ وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس شخص نے میری توہین کی۔ میری عزیز ترین چیز پر چھاپہ مارنے کے لئے اُس نے مجھے دنیا بھر میں ذلیل کیا اور آج میں انتقام لے کر کس قدر خوش ہونگا۔ اور اگر میں مارا گیا تو پھر... اُف!

شمیم - پیارے نعیم! مجھے ایسی باتیں نہ سُناؤ۔ میں بھی اسی دن کے انتظار میں تھی۔ اس پاجی انسان نے مجھے شہر بھر میں

رسوا کیا - جو خطوط اس نے مجھے لکھے وہ اس قدر توہین آمیز تھے کہ ان کی یاد سے ہی میری رگوں میں خون کھولنے لگتا ہے مجھے زبردستی تم سے چھیننا چاہتا تھا - میں صرف اسکو موت کی گھاٹ اترتے دیکھنا چاہتی ہوں اور میری زندگی کی یہی آخری آرزو ہے۔

(باہر موٹر کی آواز آتی ہے)

شمیم - میرا خیال ہے کہ مہمان آنے شروع ہو گئے ہیں - آپ باہر باغ میں چھپ جائیں اور موقع کے منتظر رہیں - راجہ کنچن پور کو میں کسی نہ کسی بہانے باہر لے آؤں گی -

نعیم - ذرا حوصلے سے - ہمت نہیں ہارنا -

شمیم - اوہ! آج میں کیونکر ہمت ہار سکتی ہوں - آج میرے سینے میں خون اُبل رہا ہے - مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میں آج کے دن کے لئے ہی زندہ تھی - مہمان آرہے ہیں - آپ اس راستے سے نکل جائیں -

(نعیم باہر چلا جاتا ہے اور خدمتگار داخل ہوتا ہے اور مہمانوں کی آمد کی اطلاع دیتا ہے - اتنے میں مہمان داخل ہوتے ہیں شمیم کا چہرہ اچانک فرطِ مسرت سے تمتما اٹھا - وہ نہایت خوش ذوقی کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کر رہی ہے - گویا اپنے

خاوند سے طلاق لے لینے کے بعد اس سے زیادہ کوئی
مسرور نہیں ۔ اِتنے میں ایک مہمان کہتا ہے :-)
مہمان ۔ مسز نعیم! آپ نے دعوت کا تو نہایت شاندار انتظام
کر رکھا ہے ۔
شمیم ۔ مسز نعیم مر چکی ہے ۔ آج صبح اس کو قبر میں بھی لٹکایا جا چکا ہے
اِس وقت صرف شمیم زندہ ہے اگر آپ لوگ مجھے قدر کی نگاہوں
سے دیکھتے ہیں تو مجھے شمیم کہہ کر پکارا کریں ۔ میں سمجھتی ہوں کہ
میں آج اِسی نام کی وجہ سے زندہ ہوں ۔
(اِسی اثنا میں دوسرے مہمان داخل ہوتے ہیں ۔ شمیم
سب کا بخندہ پیشانی سے استقبال کر رہی ہے ۔
اور ہر ایک سے نہایت شستہ مذاق کر رہی ہے اِتنے
میں جب خدمتگار چند اور مہمانوں کا جمگھٹا اپنے ساتھ
لاتا ہے تو ان کے ساتھ ڈاکٹر مشتاق بھی ہے)
شمیم ۔ ڈاکٹر مشتاق ؟ اِس وقت آپ بمبئی میں کہاں ؟ میں تو سمجھتی
تھی کہ آپ لاہور بیٹھے ہوں گے ۔ لیکن یہ رونی صورت کیوں
بنی ہوئی ہے آپ کی ؟ آپ کسی قریب المرگ مریض کی نبض تو
نہیں دیکھنے آئے ! چہرے پر ذرا سی ہنسی تو آنے دیجئے !
ڈاکٹر ۔ میں ایک ایسے مریض کی خدمت کرنے آیا ہوں جو اس وقت
بیحد خطرناک حالت میں ہے ۔

شمیم - میں کچھ نہیں سمجھ سکی - آپ معمّوں میں باتیں نہ کریں
ڈاکٹر (مہمان آپس میں باتیں کر رہے ہیں) جو کچھ میں نے کہا - یہ پہیلی تو نہ تھی - میں ایک مریضہ کو دیکھنے آیا ہوں جو اپنی زندگی میں پہلی دفعہ ایسے لوگوں میں گھِر گئی ہے -
شمیم - آپ جانتے ہیں کہ آپ اس وقت میرے مکان کی چھت کے نیچے ہیں -
ڈاکٹر - لیکن میں نعیم کا عزیز ترین دوست ہوں -
شمیم - لیکن یہ تمام لوگ جو تمہارے سامنے بیٹھے ہیں - نعیم کے دوست نہیں -
ڈاکٹر - میں آج آپ کی حفاظت کرنے کی غرض سے آیا ہوں -
شمیم - معاف کیجئے - مجھے کسی محافظ کی ضرورت نہیں -
(خدمتگار راجہ کنچن پور کی آمد کی اطلاع دیتا ہے - سارے مہمان محتاط ہو کر بیٹھ جاتے ہیں - اتنے میں راجہ صاحب داخل ہوتے ہیں)
شمیم ؎ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
میں اپنے نصیب پر کس قدر نازاں ہوں کہ آج مہاراج نے میرے غریب خانے کی تاریکی کو اجالے میں تبدیل کر دیا -
راجہ - (مسکراتے ہوئے) اگر تمہیں اس اجالے کی خواہش تھی تو یہ

ہم آج سے کئی مہینے پیشتر بھی کر سکتے تھے۔

شمیم۔ راجہ صاحب! آپ جانتے ہی ہیں کہ میرا خاوند۔۔

راجہ۔ اُف! یہ خاوند لوگ بھی بہت خود غرض ہوتے ہیں۔ کسی کا رومان پورا ہی نہیں ہونے دیتے۔

شمیم۔ اِن بیچارے خاوندوں کے ساتھ اتنی بے انصافی نہ کیجئے۔ اگر خاوندوں کی ذات نہ ہو تو دنیا میں کوئی رومان پیدا ہی نہ ہو۔ سارے رومان انہی کے دم سے تو ہیں۔

راجہ۔ شمیم! تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ خدا نے دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں بنائی۔ یہاں تک کہ شوہر جیسی بے وقعت چیز سے بھی دوسروں کا بھلا ہو جاتا ہے۔

شمیم۔ (دوسرے مہمانوں سے) میرا خیال ہے۔ ہم لوگ دوسرے کمرے میں چلیں۔ وہاں شراب کا دَور چلے گا اور تفریح کے دوسرے سامان بھی وہاں موجود ہیں۔

(سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں جانا شروع ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ سب چلے جاتے ہیں۔ صرف شمیم اور راجہ کنچن پور اسٹیج پر رہ جاتے ہیں)

شمیم۔ اُف میری طبیعت بہت گھبرا رہی ہے۔

راجہ۔ تمہاری حالت تو کچھ غیر سی ہو رہی ہے۔ میں یہ کھڑکی

کھولے دیتا ہوں۔

(کھڑکی کھولتا ہے)

شمیم۔ آہ! تازہ ہوا بھی عجیب چیز ہے۔

راجہ۔ میرے خیال میں تھوڑی دیر یہیں بیٹھ جاؤ۔

شمیم۔ میرے مہمان ہمارے متعلق خوب چہ میگوئیاں کریں گے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم ان کے پیچھے چلیں۔

راجہ۔ مہمانوں کے متعلق تم کوئی فکر نہ کرو۔ وہ سب میرے ٹکڑوں پر پلنے والے ہیں۔ تمہاری طبیعت کیوں گھبرا گئی تھی۔ کیا اس پاجی نعیم کی یاد نے تو نہیں ستایا تھا۔ آہ! آج میری خوشی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

شمیم۔ راجہ صاحب! نعیم کی پیٹھ پیچھے کیا برائی کروں۔ خواہ اس میں کتنے ہی عیب تھے لیکن آدمی اچھا تھا۔ اس وقت تو میرا اور اس کا گذارہ ہوتا رہا۔ جب ہم جھگڑتے اور وہ اپنی غلطی پر نادم ہو جاتا اور میری غلطی پر بھی وہی ہار مان لیتا۔ لیکن جب میری غلطی پر اس نے ہار ماننا چھوڑ دیا تو پھر ہمارا گذارہ مشکل ہو گیا۔ بہر صورت ہمیں اسے اچھے الفاظ میں یاد کرنا چاہیئے۔

راجہ۔ مجھے اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ وہ میرے خلاف زہر اگلا کرتا تھا اور کئی دفعہ مجھے چیلنج بھی دے چکا تھا۔ لیکن میں

محض اس لئے گریز کرتا رہا کہ وہ ایک ادنیٰ درجہ کا آدمی تھا۔ لیکن آج اگر وہ میرے سامنے آجاتے۔ تو میں اس کا چیلنج قبول کر لوں گا۔ خیر اس وقت تو ہمیں اسے معاف کر دینا چاہیئے اور آج ۔۔ آج ۔۔

(شمیم سے بغلگیر ہونے کی کوشش کرتا ہے)

شمیم۔ راجہ صاحب! دوسرے کمرے میں مہمان بیٹھے ہیں۔ ابھی وقت نہیں آیا۔ کوئی دیکھ لے گا۔ تو سخت بدنامی ہوگی۔

راجہ۔ کئی مہینوں سے تم میری درخواست کو ٹھکرا رہی ہو۔ میرے تمام پیغامات کا جواب تم نے خاموشی سے دیا۔ میں تمہاری محبت میں سب کچھ بھول بیٹھا تھا۔ ریاست کے فرائض کو میں نے تمہارے حسین چہرے پہ قربان کر دیا۔ تم مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ لیکن تم نہیں جانتیں کہ آج میرے دل میں مسرت کی لہریں اُٹھ رہی ہیں کہ میری آہ و زاری بیکار نہ گئی اور آخر کار سچی محبت کی فتح ہوئی اور تمہاری سنگدلی بھی محبت میں بدل گئی۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟

(نعیم باغ والے دروازے سے اندر آتا ہے)

نعیم۔ ہاں! راجہ صاحب! آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔

راجہ۔ (ششدر رہ جاتا ہے) تو کیا یہ مجھے پھنسانے کے لئے جال پھیلایا گیا تھا!

شمیم - راجہ صاحب! آپ نے ٹھیک سمجھا ہے۔
راجہ! تم نے مجھے دھوکا دیا؟
شمیم - اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔
راجہ - اے ایکٹرس! تم نے یہ جال کیوں پھیلایا؟
نعیم - اس کا جواب ایک ایکٹر ہی دے سکتا ہے۔ سنئیے۔ آج میں آپ کو وہ باتیں سنانا چاہتا ہوں۔ جسے آپ کبھی بھی سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ آپ اپنی فوجوں اور باڈی گارڈ کے درمیان گھرے ہوئے ایک غریب شخص کے مکان پر آتش اندازی کر رہے تھے۔ آپ کسی شخص کے گھر کو نذر آتش ہوتا ہوا دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ آپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ آپ وہ معصوم روحوں کو کچل کے ہی دم لیں گے۔ آپ ایک راجہ تھے۔ اس لئے آپ سب کچھ کر سکتے تھے۔ لیکن آج تم میرے پنجہ میں ہو۔ میں آج تمہیں حقیقتوں سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ تم سمجھتے تھے۔ کہ شمیم ایک ایکٹریس ہے۔ اس پر آسانی سے چھاپا مارا جا سکتا ہے۔ تم میرے ننگ و ناموس کو تباہ کر دینا چاہتے تھے۔ میں نے تین دفعہ تمہیں مبارزت کے لئے چیلنج دیا۔ لیکن تم ایک بزدل اور ڈرپوک انسان کی طرح گریز کرتے رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا یہ حربہ کارگر ہوا۔ اور میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں

کہ تم میرے ساتھ جنگ کرو۔

راجہ۔ اور اگر میں انکار کر دوں تو؟

نعیم۔ اگر تم نے انکار کر دیا تو تمہاری حالت کتّے سے بھی بد تر کر دونگا۔

راجہ۔ سنئے نعیم صاحب! مجھے زیادہ لمبا چوڑا بیان دینے کی عادت نہیں اور نہ ہی دھمکیوں سے ڈرنے والا ہوں۔ میں تم سے اس لئے نہیں لڑنا چاہتا۔ کیونکہ تم ایک ایکٹر ہو اور ایکٹر کی سوسائٹی میں جو حیثیت ہوتی ہے وہ تم جانتے ہی ہو۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ میں تم سے بات بھی کر دوں۔ سُن لیا آپ نے؟

(جانا چاہتا ہے)

نعیم۔ ٹھہریئے۔ آج میں تمہیں کسی قیمت پر نہیں جانے دوں گا۔ تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ایک اعلیٰ خاندان کا فرد ہوں شمیم کی محبت کی وجہ سے میں ایکٹر بن گیا تھا۔ یہ دیکھتے ہو۔ کیا ہے (جیب سے ایک کاغذ نکالتا ہے افلم کمپنی کا معاہدہ۔ میں اسی معاہدہ کو تمہارے سامنے چاک چاک کرتا ہوں (کاغذ پھاڑ ڈالتا ہے) اب غالباً تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں اب ایکٹر نہیں ہوں۔

راجہ۔ اچھا جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن یہ بات ہم تینوں میں سے کسی اور شخص کو معلوم نہ ہو کہ مجھے تم جیسے ادنےٰ شخص سے

لڑنے کا اتفاق ہوا۔

نعیم۔ تمہارے خون سے ہاتھ رنگ کر جو ذلت میں برداشت کرنے والا ہوں۔ اس کا کسی کو کانوں کان بھی علم نہ ہوگا۔

راجہ۔ اس میں شک نہیں کہ تم نے اپنے خاوند سے مل کر یہ سازش کی ہے۔ لیکن [illegible] کی موت کے [illegible] کر جو صدمہ نہیں ہوگا۔ اس کی میں پیشتر ہی تم سے معذرت کئے لیتا ہوں۔

شمیم۔ راجہ صاحب! آپ میری فکر نہ کریں۔ آپ کو لڑنا ہی ہوگا۔

راجہ۔ (نعیم سے) تو جنگ کے لئے کونسا دن مقرر کریں۔

نعیم۔ آج ہی اور اسی وقت۔

راجہ۔ لیکن [illegible] تمام میں ایک [illegible]

شمیم۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں اس کا بندوبست کر دوں گی۔ اب باہر باغ میں تیغ آزمائی کر سکتے ہیں۔

راجہ۔ اچھی بات شمیم! مجھے ایک بار پھر کہنا پڑتا ہے کہ جو صدمہ میں تجھے پہنچاؤں گا۔ اس کا مجھے [illegible] مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے۔

(راجہ باغ کی طرف باہر نکلتا ہے۔ نعیم اپنی بیوی سے گلے مل کر اس کے پیچھے چلا جاتا ہے)

شمیم۔ اُف! میں نے کیا کیا ہے [illegible] اگر بھتیجا نعیم ضرور مارا جائیگا۔ یہ میں نے کیا کیا! نہیں نہیں!! نعیم قتل نہ [illegible]

راحت - یہ تیری زندگی ہے - میں اسی کے بھروسے سانس لے رہی ہوں - میں یہ نہیں برداشت کر سکتی -

(وہ کھڑکی کی طرف دوڑتی ہے اور چلا کر کہتی ہے)

نعیم! واپس آجاؤ -

(دریچے میں پھر مہمان آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں - [illegible] ہیں - شمیم کو تنہا دیکھ کر ایک مہمان پوچھتا ہے)

مہمان - راجہ صاحب کہاں گئے؟

شمیم - افسوس وہ چلے گئے - چونکہ ریاستی معاملات میں انہیں [illegible] فوراً [illegible] کے لئے وہ [illegible] ٹھہرے

مہمان - ہم تو بیٹھے بیٹھے اکتا گئے تھے -

شمیم - تو چلئے میں آپ کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرتی ہوں -

دوسرا مہمان - آپ کی شعبدہ کاری کی دھوم تو چاروں طرف مچی ہوئی ہے - آج ہم بھی کچھ دیکھیں -

شمیم - چلو یہی سہی، کامیڈی ہو یا ٹریجڈی -

پہلا مہمان - کامیڈی -

دوسرا - نہیں ٹریجڈی

تیسرا - ہاں! ٹھیک ہے ٹریجڈی - ٹریجڈی میں آپ اپنے فن

میں یکتا ہیں۔

پہلا۔ لیکن ہم تو کامیڈی دیکھیں گے۔

ڈاکٹر۔ بھائی جھگڑا یہیں نمٹا لو۔ میرا خیال ہے کہ کامیڈی اور ٹریجڈی دونوں دیکھیں گے۔

شمیم۔ اچھا! یوں ہی سہی۔ لیکن مجھے موضوع جلد بتائیے۔ اُف! آپ لوگ کس قدر سست ہیں۔ موضوع ہی نہیں بتاتے۔

ڈاکٹر۔ ذرا ٹھہرو یہ کیا ہے؟

شمیم۔ کیا ہے؟

ڈاکٹر۔ باہر باغ میں مجھے ایک آواز سنائی دی ہے۔

شمیم۔ کچھ نہیں۔ باہر خدمتگار آپس میں کھیل رہے ہیں (دھندلی مسکراہٹ) جیسا کہ ہمیں تفریح کرنے کا حق ہے۔ انہیں بھی تو ہے۔

ڈاکٹر۔ لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوادوں کی جھنکار ہے۔

(باغ کی طرف جانا چاہتا ہے)

شمیم۔ خدا کے لئے باغ کی طرف مت جائیے۔ میں ایک عجیب پُراسرار چیز آپ کے لئے تیار کر رہی ہوں اور اگر آپ نے پہلے ہی اسے معلوم کر لیا۔ تو سارا لطف جاتا رہیگا۔

(باغ کے دروازے کو تالا لگا دیتی ہے)

لیجئے۔ ڈاکٹر صاحب! یہ رہی چابی۔ مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔

اچھا تو اب بتائیے! کس موضوع پر آپ کو محظوظ کریں۔

ڈاکٹر۔ فرض کیجئے۔ آپ ایک ایکٹر ہیں۔ ایک آوارہ ایکٹر۔ آپ ایک ہوٹل میں داخل ہوتے ہیں تو آپ سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ کون ہیں۔ آپ ان لوگوں پر اپنے فن کے ذریعہ کس طرح ظاہر کریں گے کہ آپ کون ہیں؟

(سب یک زبان ہو کر اس موضوع کی داد دیتے ہیں)

شمیم۔ بہت اچھا! سنئے . . . (اداکاری) میں کون ہوں؟ میں ایک بادشاہ ہوں اور فقیر بھی۔ وزیر ہوں اور سوداگر بھی۔ ایک بڑی ہستی ہوں اور سائیس بھی۔ میں ایک سپاہی ہوں۔ جو چور کو پکڑتا ہے۔ میں ایک چور ہوں۔ جسے سپاہی نے پکڑ لیا ہو۔ میں سب کچھ ہوں لیکن کچھ بھی نہیں۔ میں حکم دیتا ہوں اور مانتا بھی ہوں۔ میں کبھی بھوکوں مرتا ہوں اور کبھی دوسروں کو کھانا کھلاتا ہوں۔ مجھ سے خبردار رہیئے۔ میں ایک بدمعاش انسان ہوں۔ میرے تیکھے اشاروں سے بچ کر رہیئے۔ میں کہتا کچھ ہوں اور کرتا کچھ ہوں۔

(اس پر قہقہے بلند ہوتے ہیں)

ڈاکٹر۔ بھائیو! خاموشی سے سنو!

شمیم۔ کیا کہا میں نے؟ ایک بدمعاش انسان ہوں۔ بلکہ میں ایک ڈاکو ہوں۔ چور، رہزن، لٹیرا اور قاتل . . . اس کے باوجود

میں نیکی سے ہوں۔ میں نیکی سے محبت کرتا ہوں۔ میں خیرات میں روپے لٹاتا ہوں۔ ہر ایک شخص مجھے دعا دیتا ہے۔ میں لالچی اور کنجوس بھی ہوں۔ میں ایک رات میں تین دفعہ مرتا ہوں۔ لیکن مجھے دفن نہیں کرتا۔ میں ایک روح کے مانند ہوں۔ جس کو کوئی محسوس نہیں کرسکتا۔ گوشت پوست کا لباس پہنے ہوئے روح! (بہت خوب! بہت اچھا کی آوازیں بلند ہوتی ہیں) لیکن میں روح بھی نہیں ہوں۔ ایک سیدھا سادہ فانی انسان ہوں۔ میں بہت سے متضاد عناصر کا ایک مرکب ہوں۔ بے اعتدالیوں کا ایک مجموعہ۔ . . آج یہاں کل وہاں۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ ایک چلتی ہوئی سانس۔ ڈھلتی پھرتی چھاؤں۔ . . صاحبان! میں ایک ایکٹر ہوں۔

(بہت اچھا، کیا بات ہے شمیم صاحبہ! آپ نے ایکٹر کی تعریف میں کمال کر دیا، "بیشک" کی آوازیں آتی ہیں اور تمام مہمانوں میں شور مچ جاتا ہے۔ اس اثنا میں شمیم کی حالت بہت غیر ہو جاتی ہے وہ گرتی پڑتی اٹھتی ہے اور کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے)

شمیم۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں (باہر ایک چیخ سنائی دیتی ہے اور وہ نڈھال ہو کر گر پڑتی ہے۔ صاحبان! میں اس سے زیادہ اب کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرا شوہر باہر راجہ صاحب سے تیغ

آزمائی کر رہا ہے۔ میں نے ابھی ابھی اپنے شوہر کی چیخ سنی ہے خدا کے لیے ان دونوں کو باز رکھو۔ کہیں میرا شوہر نہ مارا جائے اس جنگ کی میں ہی ذمہ دار ہوں وہ میرا شوہر ہے میری زندگی ہے میری دنیا ہے میرے لیئے سب کچھ ہے۔ اے خدا! مجھے معاف کیجئے۔ نعیم!! ان کو چھڑاؤ۔

(زار و قطار رو تی ہے)

(سب یک زبان ہو کر اسکی داد دیتے ہیں)

ایک مہمان - بہت خوب۔ نقل کو اصل کر کے دکھا دیا۔

دوسرا - اداکاری کا فن اسی کا نام ہے۔

شمیم - تم میری طرف دیکھ رہے ہو۔ اُف میں اداکاری نہیں کر رہی۔ تم بُت بنے بیٹھے ہو۔ اُٹھو اور ان دونوں کو چھڑاؤ آف۔ میری زندگی پر ایک آخری ضرب لگنے والی ہے۔ میں نے ہی اپنی محبت کا خاتمہ کیا ہے۔ میں کہہ رہی ہوں کہ وہ پاجی میرے شوہر کو ہلاک کر دیگا۔ کیا تم میں سے کوئی بھی انہیں چھڑائیگا؟ نعیم! نعیم! میں خود تمہارے پاس آ رہی ہوں۔

(وہ دروازے کو دیوانہ وار کھولنا چاہتی ہے لیکن وہاں قفل لگا ہوا ہے۔ وہ مایوس ہو کر فرش پر گھٹنے ٹیک دیتی ہے)

سب - بہت خوب! بہت خوب!! شاباش!
ڈاکٹر - دیکھا آپ نے؟ شمیم ترپیڈی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی۔
سب - بیشک
شمیم - اُف! (ماتھے پہ ہاتھ مار کر) کیا آپ میں سے کسی شخص کی بھی آنکھیں نہیں ہیں؟ کیا تم نے کسی عورت کا دل ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھا؟ (اچانک)
ڈاکٹر صاحب! میں نے آپ کو چابی دی تھی۔ آپ نعیم کے دوست ہیں۔ لایئے چابی۔ خدا کے لئے مجھے چابی دیجئے۔
(سب لوگ نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے ہیں)
ڈاکٹر - دوستو! معلوم ہوتا ہے کہ شمیم سچ مچ کی باتیں کر رہی ہے۔ دیکھو تو سہی اس کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ یہ سچی بات معلوم ہوتی ہے۔
شمیم - ہاں! ہاں! ڈاکٹر صاحب۔ بالکل سچی۔ وہ نعیم کو قتل کر دیگا۔ میری زندگی تباہ ہو گئی۔
ایک مہمان - شمیم آپ واقعی ایکٹرس ہیں۔ آپ نے ڈاکٹر جیسے جہاندیدہ انسان کو شک میں ڈال دیا۔
دوسرا - ڈاکٹر صاحب! آخر آپ کو شمیم نے بیوقوف بنا دیا نا!
ڈاکٹر - آپ کے مذاق کے باوجود مجھے یقین ہے کہ شمیم اداکاری نہیں کر رہی۔ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے۔ وہ واقعہ ہے اِس

لئے میں قفل کھولتا ہوں۔

(قہقہے بلند ہوتے ہیں اور ڈاکٹر کا مذاق اڑایا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر قفل کھولتا ہے۔ شمیم دیوانہ وار دروازے کی طرف بھاگتی ہے اور دہلیز پر نعیم آتا ہے جس کا رنگ زرد ہو رہا ہے اور بغیر کوٹ کے ہے۔ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ جسے وہ رومال سے صاف کرتا ہے)

ڈاکٹر۔ نعیم! (تمام مہمان ششدر رہ جاتے ہیں)

شمیم۔ نعیم! تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟

نعیم۔ بالکل نہیں۔

شمیم۔ اور راجہ؟

نعیم۔ باغ میں پڑا ہوا آخری سانس لے رہا ہے۔

شمیم۔ (اپنے اندر ایک نئی زندگی محسوس کرتے ہوئے) صاحبان! میں نے آپ سے کہا تھا نا۔ کہ میں آپ کے لئے ایک عجیب حیران کن چیز تیار کر رہی ہوں۔ وہ یہی ہے۔ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے میری حوصلہ افزائی کی اور میرے فن کی پوری پوری داد دی۔ اُمید ہے میرے ڈرامہ میں آپکو خوب تفریح حاصل ہوئی ہو گی۔

(وہ جھکتی ہے اور تمام مہمان نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے ہیں اور بعض ابھی تک ڈاکٹر کا مضحکہ اڑا رہے ہیں پردہ گرتا ہے)

ماتم

(ایک طنزیہ ڈرامہ)

کردار:-

فیروزہ ——— ایک حسین عورت
شہناز ——— ایک فوجی سپاہی
رؤف ——— فیروزہ کا باپ (سن رسیدہ)
گلنار ——— فیروزہ کی خادمہ

منظر

(قبرستان، تہ خانے میں ایک قبر۔ قبر ابھی تک غیر مکمل ہے۔ فیروزہ کا خاوند قاسم تین روز ہوئے مر چکا ہے۔ اس کی لاش کو مسالے سے دھو کر صندوق میں بند کر دیا گیا۔ لیکن منہ کھلا ہے۔ فیروزہ سر جھکائے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ چہرے سے حیرت برس رہی ہے۔ ان کی شادی کو صرف ایک ہی سال ہوا تھا۔ کبھی کبھی سسکیوں سے... کی خاموشی ٹوٹتی ہے۔ گلنار نہایت غمناک صورت بنائے پاس ہی بیٹھی ہے)

گلنار۔ بیگم۔ دنیا میں زندگی دوڑ رہی ہے۔ ہر ایک چیز زندہ ہے اور زندگی کا ثبوت دے رہی ہے۔ آپ زندہ ہو کر بھی مردوں سے بدتر ہیں۔ آنکھیں کھولو اور کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو تسکین دو۔

فیروزہ۔ (غمگین مسکراہٹ سے) دل کو تسکین دوں۔ ایک موہوم خیال لئے ہوئے میرے دیدے اس قدر سفید تو نہیں ہو گئے عمر بھر کا سوگ لے کر بیٹھی ہوں۔ گلنار! تم تو اچھی طرح جانتی ہو مجھے ان سے کس قدر محبت تھی۔ پھر کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو؟

گلنار۔ لیکن بیگم۔ یہ کب تک۔ دنیا میں ایسے ہوتا ہی آیا ہے۔ انسان رو پیٹ کر صبر کر جاتا ہے اور اس کے سوا ہو کیا سکتا ہے؟

فیروزہ۔ دنیا میں ہوتا ہوگا۔ لیکن ان کے مرجانے کے بعد میں دنیا اور دنیا والوں میں شمار نہیں ہو سکتی۔ میں اس دنیا میں پہنچ چکی ہوں، گلنار جہاں درد اور غم کے سوا کچھ نہیں۔ میرے لئے دنیا ایک ظلمت کدہ ہے ایک ویرانہ ہے۔ جہاں سے کبھی بھی مسرت کی خفیف تریں آواز بلند نہیں ہو سکتی ہے۔ ایک صحرا ہے جس میں خوشنما پھول کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ سوچو تو سہی ذرا گلنار۔ ان کے بغیر دنیا کس قدر پھیکی معلوم ہوتی ہے یہی سمجھ لوں گی کہ عمر کے لئے ایک تاریک زنداں میں پھینک دی گئی ہوں۔ ایک ماتم خانہ میں عمر بسر کر رہی ہوں... ماتم کئے جاؤں گی... جب تک زندہ ہوں۔ مرنے کے بعد بھی میری روح ماتم کرتی رہے گی... حشر تک سوگوار

ہوں گی۔ (سسکی کی آواز)

گلنار۔ بیگم، میں نے تمہیں بیٹی کی طرح پالا تھا۔ بچپنے سے تمہاری والدہ نے تمہیں مجھے سونپ دیا تھا۔ اگر میری اپنی بیٹی ہوتی تو شاید اتنی محبت نہ کرتی جتنی کہ تم سے کرتی رہی ہوں۔ آج ایک میری معمولی سی درخواست ٹھکرائی جا رہی ہے۔ اس محبت کا واسطہ دے کر۔ ۔ ۔

فیروزہ۔ رہنے دو، گلنار رہنے دو۔ یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ جس چیز نے میری کشتی حیات کا رخ بدل ڈالا۔ جس واقعہ سے میری روح گہرائیوں میں ڈوب کر فنا ہو گئی۔ اُسے تم معمولی چیز سمجھ رہی ہو؟ گلنار، تم نے مجھ سے محبت کی اور محبت سے پال پوس کر بڑا کیا۔ اس کے بدلے میں صرف اتنا کر سکتی ہوں کہ تمہاری محبت کی قدر کروں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس چیز سے مجھے انتہائی محبت ہے۔ اُسے چھوڑ دوں؟ قلیل خدمت کا تم بہت بڑا معاوضہ طلب کر رہی ہو۔ ۔ ۔ میں اپنی جان تمہیں دے سکتی ہوں۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا میرے آقا! کیا کہہ رہی ہے گلنار، تم اٹھ کیوں نہیں؟ تم تو مردوں کی طرح سوتے پڑے ہو، خاموش ہو!

گلنار۔ خدا کے قانون کے مطابق وہ اب مردہ ہی ہیں۔

فیروزہ۔ خدا کا قانون، محبت سے خدا کا قانون توڑا جا سکتا ہے

گلنار، تم تو مجھے جانتے ہی ہو۔ مجھے تم سے کیسی محبت ہے پھر یہ خاموشی کیسی؟ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر تم قبر میں ہو تو مر چکے ہو۔ میں اس وقت تمہارے ساتھ ہوں اور میں زندہ ہوں۔ جہاں زندگی ہو وہاں موت کیوں؟ میرے سرتاج ذرا آنکھیں کھولو۔ تاکہ روشنی رقص کرتی ہوئی ان میں داخل ہو۔

گلنار۔ آہ! (سرد باتی ہوئی روتی ہے۔)

فیروزہ۔ گلنار، تم رو رہی ہو۔ تم ایسی رو رہی ہو گویا وہ مر چکے ہیں۔ تم غلطی پہ ہو وہ تو زندہ ہیں میرا سینہ چیر کر دیکھو۔ اُن کی زندگی میں نے وہاں چھپا رکھی ہے۔ دنیا اندھی دنیا والے اندھے۔ جو ایک زندہ انسان کو مردہ تصوّر کر رہے ہیں۔

گلنار۔ (سسکیاں لیتے ہوئے) بیگم یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔۔ خدا کا قانون ۔۔۔

فیروزہ۔ لیکن تم تو اندھی نہیں ہو گلنار۔ میری محبت کی وجہ سے تم ایسی باتیں کر رہی ہو یا مجھے غلط راستہ پر لگانا چاہتی ہو۔ آہ! میری وجہ سے تم خواہ مخواہ اتنی مصیبت اُٹھا رہی ہو، تم کو میں نے اتنا پریشان کیا۔۔۔ دل ہی دکھ دیا۔ ۔۔ مجھے معاف کر دو گی۔

گلنار۔ میں تو مرتے دم تک تمہارے ساتھ رہوں گی۔

فیروزہ۔۔۔ تم نہیں سمجھ سکتیں گلنار، میاں میں بیٹھی ہوں، میری دنیا ہے۔ جو کچھ میں کر رہی ہوں یہ میری زندگی ہے تمہاری اور میری زندگی کے دو الگ راستے ہیں تم جاؤ۔۔۔ تم جاؤ۔ زندگی کی شورشوں اور جھمیلوں میں اپنی زندگی بسر کرو۔ یہ جگہ تمہارے لئے نہیں۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ تم زندہ درگور ہو جاؤ۔ تم نے آج تک میری تن دہی سے خدمت کی۔ میں اس کا احسان کس طرح اتار دوں۔ یہ میں نہیں بتا سکتی۔ میں نے تمہیں دُکھ دیا۔ اس لئے معافی چاہتی ہوں۔ اس جگہ میری ہڈیاں بھی فنا ہو جائیں گی۔ اس وقت چند لمحوں کے لئے یہاں آنا اور مجھے یاد کرنا۔ اس وقت میری اور مرنے والے کی روحیں اکٹھی ہوں گی۔ میری روح تمہیں دیکھ کر مسرت سے لپٹ جائے گی۔

گلنار۔ بیٹی۔ جب تم پیدا ہوئی تھیں تو اس وقت بھی میرا کوئی نہ تھا تمہاری والدہ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ میری اس محبت کو رشک کی نظروں سے دیکھا کرتی تھیں۔ اُن کے مرجانے کے بعد میں نے تمہیں بالکل ہی اپنا بنا لیا۔ آج تم مجھے دھکیل کر باہر نکال رہی ہو۔۔۔ کیوں؟ کیا یہی صلہ دیا ہے؟۔۔۔ تمہیں روتا چھوڑ کر یہاں سے چلی جاؤں۔ لعنت ہے میری زندگی پہ۔ بیٹی اس دُنیا میں

میری زندگی صرف تمہارے لئے ہی ہے۔ تمہارے سوا میرا اور کوئی نہیں تو پھر کس لئے اپنی جان قربان کرنے سے منع کرتی ہو تم دُکھ میں رہ کر خون کے آنسو بہاؤ اور میں دنیا میں آرام سے رہوں۔ تمہاری بے کسی پر درو دیوار رو رہے ہیں اور میں تمہیں موت کے منہ میں چھوڑ کر چلی جاؤں۔۔ بیٹی۔ مجھے اپنے دامن سے لگی رہنے دو۔

فیروزہ۔ گلنار۔ تم نے میرے ساتھ وہ کیا جو سگی ماں بھی نہ کر سکتی تھی۔ کاش میں ایک دفعہ پھر زندہ ہو جاتی۔ تو کسی طرح تمہارے احسان سے سبکدوش ہو سکتی۔۔۔

(ایک آدمی سیڑھیوں سے اُترتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ فیروزہ لاش پر جھک جاتی ہے اور زور زور سے سسکیاں لیتی ہے۔ گلنار مڑ کر دیکھتی ہے)

گلنار۔ تمہارے والد ہیں۔

(رؤف قبر کے نزدیک آتا ہے۔ چہرے سے انتہائی حسرت ٹپک رہی ہے۔ کمر خمیدہ اور گال پچکے ہوئے۔ اور آنکھوں سے دو بڑے بڑے آنسو ڈھلک پڑے ہیں)

رؤف۔ بیٹی اس بڑھاپے میں بھی پریشان کر رہی ہو۔ اُٹھتا بیٹھتا اور لڑکھڑاتا ہوا کئی بار تمہارے پاس آیا۔ تمہیں میرے بڑھاپے پر ترس نہ آیا۔ قبر میں پاؤں لٹکائے تو بیٹھا ہی ہوں لیکن تمہارا

غم اور سوگواری دیکھ کر بالکل بے جان سا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہوں۔ کلیجہ بالکل چھلنی ہو گیا ہے۔ آخر یہ سوگواری کب تک۔ مجھ پر نہیں تو اپنے آپ پر ہی رحم کرو ....

فیروزہ۔ (لاش پر نظریں جمائے ہوئے) ابا۔ آپ خواہ مخواہ یہاں آنے کی تکلیف گوارا فرما رہے ہیں۔ میرا جواب وہی ہے جو پہلے تھا۔

روف۔ (ذرا تیزی سے) بیٹی! کیا اس دن کے دیکھنے کے لئے تمہیں پالا تھا۔ ایک جنون ہے جو تمہارے دماغ میں سما گیا ہے۔ شہر میں مجھے کوئی چلنے نہیں دیتا۔ جدھر دیکھو۔ تمہاری ہی بات ہو رہی ہے۔ لوگ میرا میرے خاندان کا مضحکہ اڑا رہے ہیں بازار میں چلنا دوبھر ہو گیا ہے (نرمی سے) بیٹی! ذرا سوچو تو سہی اس سے حاصل ہی کیا ہو گا۔

فیروزہ۔ (غمگین مسکراہٹ سے) اچھا تو اب مجھے اس لئے یہاں سے نکالنے آئے ہیں تاکہ آپ بازار میں چلنے کے قابل ہو جائیں آپ کے ہمسائے آپ پر انگشت نمائی نہ کریں۔ یہی بات ہے نا۔ میری خواہشات کو ٹھکرا کر، میری آرزوؤں کو کچل کر۔ آپ اپنے اور اپنے خاندان کے لئے سرخرو ہونا چاہتے ہیں اور جو کچھ میں کر رہی ہوں۔ وہ محض اس لئے جنون ہے کہ دنیا والے کہتے ہیں کہ یہ برا ہے۔ اگر آج دنیا والے میرے فعل کی تعریف کرنا شروع

کردیں تو آپ خاموش ہو جائیں گے۔

رؤف۔ بیٹی۔ میں نے یہ کب کہا۔ تم تو۔

فیروزہ۔ ابّا جان! میں خوب سمجھتی ہوں۔ آپ لوگ تو معاشرتی عزّتوں کے بھوکے ہیں۔ آپ کو کسی کی آرزوؤں سے کیا مطلب میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ میں اب موت کی وادی میں مکین ہوں یہی بات اگر آپ اپنے آشناؤں سے کہہ دیں تو وہ آپکا مضحکہ کیوں اڑائیں گے (لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) انکے مرجانے کے بعد بھلا میرا کون رہ گیا ہے۔ آپ مجھے ناحق ستا رہے ہیں۔

رؤف۔ بیٹی، تم میری زندگی ہو... میری زندگی کا حصہ... میں تمہارا خداوند ہوں۔ میں تمہاری پیدائش کا ذریعہ بنا۔ وہ تمہارا خاوند تھا۔ میں نے ایک گائے بھینس کی طرح تمہیں اس کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ اس نے تمہیں مجھ سے خریدا لیکن خداوند کا رتبہ خاوند سے بلند ہوتا ہے۔

فیروزہ۔ (لاش کو مخاطب کر کے) ابھی ایک سال کا عرصہ ہوا میرے باپ نے میری تم سے شادی کی۔ شادی کے پیمان کو وہ خرید و فروخت کا مرتبہ دے رہے ہیں۔ وہ بھول گئے ہیں کہ نکاح ایک آسمانی عہد و پیمان ہے۔ جس کے بعد دنیا کی کوئی طاقت اسے منسوخ نہیں کر سکتی۔ کس قدر حیرت کا

مقام ہے کہ اس وقت جبکہ تم پر اتنی مصیبت پڑی ہوئی ہے وہ مجھے تم سے چھیننا چاہتا ہے۔۔۔ میرے بزرگ خاوند کے مرنے کے بعد بھی بیوی کی جگہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ بھلا موت ہم کو ایک دوسرے سے کیونکر جدا کر سکتی ہے۔ موت تو زندگی کا ایک حادثہ ہے۔ اِس حادثے کے بعد کیا میاں بیوی بھی الگ ہو سکتے ہیں۔

رؤف ۔ یہ سب توہمات ہیں۔ قاسم مر چکا ہے۔ اب کبھی بھی وہ واپس نہیں آ سکتا۔ بیٹی۔ آج میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میری جان میری بوسیدہ ہڈیوں کے پنجرے میں پھڑپھڑا رہی ہے ۔۔ قاسم مر چکا ہے اور میں زندہ ہوں۔ اس لئے آج مجھے تمہاری خدمت کی ضرورت ہے۔

فیروزہ ۔ (لاش کی طرف دیکھتے ہوئے) سن رہے ہو نا۔ رکتنا خود غرض ہے۔ اپنے عیش و آرام کے لئے مجھے تم سے چاہتا ہے۔ آہ!۔۔۔ اس دنیا میں مطلب کے سوا۔۔ کیا ہے۔

(رؤف) سر دونوں ہاتھ سے پکڑے ہوئے۔ لکڑی ٹیکتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ فیروزہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ گلنار بیقرار سی نظر آتی ہے)

گلنار۔ تمہارے والد کی حالت نہایت خستہ ہو رہی ہے۔ غم سے رہی سہی طاقت بھی جاتی رہی ہے۔

فیروزہ۔ تمہارا کیا مطلب ہے۔ کیا میں اس بوڑھے کی آسائش کے لئے اپنے آقا کا ساتھ چھوڑ دوں؟

گلنار۔ یہ تو میں نہیں کہتی۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔

فیروزہ۔ لیکن

(ایک آدمی سیڑھیوں سے اُترتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ جھکتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ گلنار حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ ایک جسم مضبوط اور خوبصورت نوجوان فوجی سپاہی ہے۔ چہرے سے مسرّت ٹپک رہی ہے۔ لاش کو دیکھ کر اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ البتہ فیروزہ کے حسین اور مغموم چہرے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک تغیّر سا پیدا ہوتا ہے)

شہباز۔ خیریت تو ہے۔

گلنار۔ ہاں

فیروزہ۔ لیکن آپ کو یہاں آنے کی کس نے اجازت دی؟

شہباز۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یونہی اندر چلا آیا اگر آپ منع کرتی ہیں تو میں ابھی باہر چلا جاتا ہوں

میں کسی کام آسکوں تو میری جان بھی حاضر ہے۔

فیروزہ۔ (رکتی ہوئی آواز سے) میں اپنے آپ کو دفن کر چکی۔ پھر بھی یہ لوگ مجھے دم نہیں لینے دیتے۔ میرا آقا موت کی نیند سو رہا ہے اسے خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

شہباز۔ اوہو! میں اب سمجھا! آپ اپنے خاوند کا ماتم کر رہی ہیں ایک مردہ انسان کو زندہ سمجھ کر اس کے سرہانے بیٹھی ہیں۔ یہی بات ہے نا؟

فیروزہ۔ (بے توجہی سے) آپ لوگوں کے لئے وہ مردہ ہے لیکن میرے لئے زندہ ہیں۔

شہباز۔ خاتون۔ آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔

فیروزہ۔ فیروزہ۔

شہباز۔ فیروزہ! مجھے معاف کیجئے گا۔ میں آپ کو فیروزہ کہہ کر مخاطب کروں گا۔ غالباً آپ برا نہیں مانیں گی۔

(فیروزہ اس کی طرف دیکھتی ہے اور ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ کھیل جاتی ہے)

شہباز۔ فیروزہ! میں ایک فوجی سپاہی ہوں۔ میں شاعر بھی ہوں۔ فرض کے ساتھ ساتھ میرے سینے میں اچھوتی رنگینیاں بھی موجزن ہیں۔ اگر میں یہ سمجھتا کہ موت اور زندگی ایک ہی وقت میں

دوش بدوش چل سکتی ہیں۔ میں آپ کو کبھی منع نہ کرتا۔ بحیثیت سپاہی اور شاعر ہونے کے میرا یہی فرض تھا۔ لیکن اس وقت فوری غم کی وجہ سے موت اور زندگی میں تمیز نہیں کر سکتیں۔ دیکھیئے نا! ایک مرد کے ساتھ آپ ایسی حسین و جمیل زندہ تصویر۔ ۔ ۔

فیروزہ۔ گلنار! باہر سے پانی کا ایک ٹھنڈا گلاس لاؤ۔ میرا حلق سوکھ رہا ہے۔

(گلنار لڑکھڑاتی ہوئی باہر نکل جاتی ہے)

شہباز۔ ہاں۔ آپ ایسی حسین و جمیل زندہ تصویر کا بیٹھنا کس قدر افسوسناک بات ہے۔ تمہارا حسن ایک بے پناہ حسن ہے جو۔ ۔ ۔

فیروزہ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میں تو۔ ۔ ۔ ۔

شہباز۔ ہاں ہاں! میں سمجھتا ہوں۔ تمہارا حسن ایک بے پناہ حسن ہے جو سوگوار ہو کر ساری کائنات کو سوگوار بنا رہا ہے تمہاری نشیلی آنکھوں سے جب آنسوؤں کے قطرے ٹپکتے ہیں تو عرش اعظم میں بھی شگاف پڑ جاتے ہیں۔ لیکن اس مردے کو حرکت تک نہیں ہوتی۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں۔ صرف مٹی کا ڈھیر، تمہارا حسن عالم سوز ہے۔ تمہارے شباب کی مسرت زا رنگینیاں چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں۔

فیروزہ (ادا سے مسکراتے ہوئے) لیکن میرا شباب۔ ۔ ۔ ۔

شہباز۔ کچھ بھی ہو تم حسین ہو۔ تم نوجوان ہو۔ تمہارا ہاتھ اگر پتھّر سے چھو جائے۔ تو اس میں جان ڈال سکتا ہے (فیروزہ کی طرف محبّت بھری نگاہ ڈال کر) آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تمہاری لانبی لانبی پلکوں کے سائے میں ایک دنیا آباد ہے۔ تمہارے حسن بے پناہ سے تمام دُنیا کے چراغ روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔

فیروزہ۔ (پھر مسکراتے ہوئے) آپ نے مجھ میں ایک تبدیلی سی پیدا کر دی ہے۔

شہباز۔ (آہستہ) کیونکہ پہلی نظر میں... تم نے میری دنیا... بدل ڈالی... آؤ نکلو اِس نفرت گاہ سے... چلو عشق کی دنیا میں... کیا میں تمہارے ہاتھ چوم سکتا ہوں۔

فیروزہ۔ (اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے) ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

(شہباز ہاتھ کو چُومتا ہے۔ اور اس پر اپنی آنکھیں ملتا ہے فیروزہ ایک عجیب مسرّت میں ڈوب جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں بند کرتی ہے۔ بوڑھی گلنار اُترتی ہوئی دکھائی دیتی ہے فیروزہ جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتی ہے)

فیروزہ۔ (گلنار سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے) آپ کے آنے سے مجھے بہت تسکین ہوئی۔

شہباز - شکریہ - میں ذرا باہر ہو تا آؤں - باہر سڑک کے کنارے تین لاشیں لٹکی ہوئی ہیں - انکی نگہبانی کر رہا ہوں وہ تینوں نہایت خوفناک انقلاب پسند تھے - حکومت نے حکم دیا ہے کہ وہ تینوں ایک دن اور ایک رات لٹکی رہیں - تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں - یہ افواہ گرم ہے کہ ان کے دوست لاشیں چرانے کا ارادہ رکھتے ہیں - اس لئے ذرا دیکھتا ہوں -

فیروزہ - ہاں ضرور دیکھ آئیے - لیکن جلدی واپس آئیے گا -

شہباز - (مسکراتے ہوئے گلنار کی طرف دیکھتا ہے) کیوں جی! کیا آپ بھی اپنے خاوند کا ماتم کر رہی ہیں (فیروزہ مسکراتی ہے)

گلنار - نہیں جناب! میں خادمہ ہوں اور مالکہ کے ساتھ رہنا میرا فرض ہے -

شہباز - اوہو، کمبخت فرض آپ لوگوں میں بھی ہے - میں سمجھتا تھا - کہ یہ قید صرف ہم سپاہیوں کے لئے ہی ہے (شہباز مسکراتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

فیروزہ - گلنار! کس قدر اچھا انسان تھا - کتنا خوبصورت تھا - اس کی ہر ایک بات سے شیرینی ٹپکتی تھی -

گلنار - بڑا ہنس مکھ ہے (مسکراتی ہے)

فیروزہ - ایسا خندہ رو انسان تو مجھے آج تک نہیں ملا - میں تو اپنے میں ایک تبدیلی سی محسوس کر رہی ہوں - ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ اڑی جارہی ہوں . . . گلنار! لاش کا مُنہ
کفن سے ڈھانپ دو۔

(گلنار لاش کا مُنہ کفن سے ڈھانپتی ہے)

فیروزہ - میرے خیال میں صندوق بھی بند کر دو۔

(گلنار صندوق کا ڈھکنا بند کرتی ہے)

فیروزہ - معلوم ہوتا ہے۔ وہ آرہا ہے -

(شہباز ہانپتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے)

شہباز - اُف غضب ہوگیا -

فیروزہ - کیوں خیر تو ہے ؟

شہباز - ایک لاش اڑا لے گئے -

فیروزہ - پھراب کیا ہوگا ؟

شہباز - ہونا کیا ہے - نوکری سے برطرف کر دیا جاؤنگا ممکن ہے اس کی پاداش میں جیل بھی جانا پڑے -

فیروزہ - کیا کہا ؟ جیل ؟

شہباز - ہاں بہت خطرناک معاملہ ہے۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ تمہیں پاکر میں نے سب کچھ پالیا ہے۔ اب مجھ سے زندگی چھین لی جائے تو کچھ پروا نہیں۔ صرف یہی مصیبت ہے کہ زندہ تو رہنا پڑے گا لیکن ذلیل ہو کر جیل میں . . . خیر کچھ پروا

نہیں۔

فیروزہ - میں کس قدر شرمسار ہوں کہ میری وجہ سے آپ پر یہ عذاب نازل ہوا۔

شہباز - آپ غمگین کیوں ہو رہے ہیں۔ میں تنومند ہوں۔ ہٹا کٹا ہوں۔ سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں۔

فیروزہ - میں کس طرح برداشت کر سکوں گی۔

(فیروزہ صندوق کی طرف دیکھتی ہے پھر شہباز کی طرف نگاہ ڈالتی ہے۔ شہباز بھی پہلے صندوق پھر فیروزہ کی طرف دیکھتا ہے۔ اور دونوں کی معنی خیز ادا میں آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ فیروزہ مسکراتی ہے)

فیروزہ - ٹھیک ہے نا؟

شہباز - آپ کو نہایت اچھی تدبیر سوجھی۔

(شہباز اور فیروزہ دونوں صندوق سے لاش کو باہر نکالتے ہیں)

فیروزہ - وہاں لٹکے رہنے سے اسکے وقار میں فرق تو نہ آئے گا۔

شہباز - ہرگز نہیں۔

(لاش کو لیئے ہوئے باہر نکل جاتا ہے۔ گلنار لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے جا رہی ہے اور پھر نکل کر تہ خانہ کے دروازہ کو قفل لگاتی ہے)—پردہ—

چندن

نہایت مفید افسانوں کا مجموعہ۔ جس پر ریویو کرتے ہوئے ایک بنگالی اخبار نے لکھا تھا "اگر یہ کتاب بنگالی زبان میں ہوتی۔ تو اس کی ایک ایک کاپی ہر گھر میں ہوتی"
تقطیع ۵ × ۷½ "۔ ۳۶۸ صفحے مجلد قیمت تین روپے

محبّت کا انتقام

یہ بہترین ناٹک ہے۔ جس کی اشاعت پر ملک کے طول و عرض میں شور مچ گیا۔ اس کے ہندی ایڈیشن پر سدرشن صاحب کو حکومت پنجاب نے پانچسو روپیہ انعام دیا تھا۔ قیمت دو روپے

طائرِ خیال

نہایت مفید بارہ کہانیوں کا مجموعہ۔ قیمت دو روپے

قوم پرست

یہ بنگال کے ایک نامور ناٹک نویس بابو دویجندر لال رائے کا ایک مشہور تاریخی ناٹک ہے۔ جسے مہاشہ سدرشن نے اہم رد و بدل کے ساتھ ترجمہ کیا۔ قیمت دو روپے

اندھے کی دُنیا

تین ایکٹ کا ناٹک مہاشہ سدرشن کے مخصوص انداز میں۔ قیمت دو روپے

بے ستون

مصنفہ ادیب شہیر انور کمال۔ یہ ایک اچھوتا ناول ہے۔ دو سو صفحے معہ گرد پوش رنگین۔ قیمت دو روپے

شکاری

مصنفہ رئیس احمد صاحب جعفری - نہایت دلچسپ ناول جس میں نفسیاتی رنگ خوب نمایاں ہے - ۳۰۴ صفحات مجلد مع گرد پوش رنگین - قیمت تین روپے

چغتائی کے افسانے

مصنفہ مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے - ایل ایل بی - یہ مجموعہ مذاحیات کا ادبی شاہکار ہے جس میں افسانوں کے علاوہ فکاہات - مذاحیات - مذاحیہ ڈرامے - طنزیات اور ادبیات وغیرہ مندرج ہیں یہ ظرافت کی جان اور لطافت کی کان ہے - ضخامت حصہ اوّل ۳۰۵ صفحے - قیمت تین روپے ضخامت حصہ دوم ۲۵۸ صفحات قیمت اڑھائی روپے

روپ چھل

مصنفہ عبد المجید بھٹی - یہ کہانیوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے - قیمت سوا روپیہ

تدبیر و تقدیر

مصنفہ مرتضےٰ احمد خان افغان - گیارہ افسانوں کا مجموعہ قیمت ڈیڑھ روپیہ

مشرق و مغرب کے افسانے

مرتبہ عاشق بٹالوی - اِس کتاب میں ہر ملک کے عجیب و غریب افسانے درج ہیں - جنہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے - لکھائی چھپائی عمدہ جلد مضبوط قیمت پانچ روپے

تاج کمپنی لمیٹڈ۔ قرآن منزل ریلوے روڈ لاہور

م جدرل

تاج
کمپنی لمیٹڈ
لاہور کراچی